KitabPK.Com

شازیہ چودھری

جلاد نے بانہیں کھولیں

ناولٹ

"کیا بات ہے ڈاکٹر مظہر! تھک گئے کیا؟" میرے ساتھی ڈاکٹر شہباز کی آواز نے مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا تھا۔

"نہیں تھکنا کیا بس یونہی ریلیکس ہو رہا تھا۔ تمہاری ڈیوٹی ختم ہو گئی؟" میں کرسی پر سیدھا ہو گیا تھا۔

"ہوں بہت رش رہا آج۔ میرا تو حشر نشر ہو گیا۔" وہ بھی میری ساتھ والی کرسی پر گر گیا تھا۔

"آج ہاسپٹل کے ایم ایس ڈیوٹی پر نہیں آئے؟" میں نے خان وجاہت ابراہیم کے متعلق استفسار کیا۔

"ملک ہیں بھئی۔ آئیں نہ آئیں۔ ان کی منگیتر صاحبہ جو راؤنڈ لینے آن پہنچی تھیں۔ ویسے غضب کی چیز ہے یہ خان زادی۔ صورت مثل حور ہے مگر انداز و ادا سے "جلاد" دکھائی دیتی ہے۔ مجال ہے جو کسی کو لفٹ کرائے۔"

شہباز نے منہ بنا کر کہا۔

"ہر وقت اپنے گھمنڈ میں رہتی ہے۔ کسی کو گھاس نہیں ڈالتی۔ غنیمت ہے جو خان وجاہت ابراہیم سے سیدھے منہ بات کر لیتی ہے۔ بھئی کل کلاں کو ان کے پلے جو بندھنا ہے۔ ورنہ شاید انہیں بھی خاطر میں نہ لائے۔ ابھی صرف اگزام دے کے آئی ہے ایم بی بی ایس کا مگر اکڑی یوں پھرتی ہے۔ جیسے ابھی سے ہسپتال کا چارج سنبھال لیا ہے۔"

ڈاکٹر شہباز بڑی تفصیل سے خان زادی شیمل ابراہیم کے متعلق جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہا تھا۔

"ہمیں کیا لینا دینا خان زادی کے انداز و ادا سے۔ وہ جانیں یا ان کے منگیتر خان وجاہت صاحب۔ ہمیں تو اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔"

مجھے کسی عورت کے بارے میں کھوج رکھنے کی عادت نہیں، سو سادگی سے موضوع سمیٹنا چاہتا تھا۔ شہباز کا روز کا معمول تھا جب بھی خان زادی اپنے باپ خان حیات ابراہیم کے قائم کردہ اس پرائیویٹ ہسپتال کا چکر لگاتی تھی۔ شہباز اس کو دیکھ دیکھ کر اسی طرح جلتا کڑھتا تھا۔

"تو تو ہے ہی پکا پینڈو۔ بندے کو اتنا سیدھا، بیبا اور

KitabPK.Com

KitabPK.Com

بھلا مانس نہیں ہونا چاہیے۔ کچھ چالاکی پیدا کرو اپنے اندر، یہ کیا کہ اردگرد سے بے خبر بس حقوق و فرائض کے کھونٹے سے بندھے کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی ڈگر پر چلتے رہتے ہو۔"

میں بے ساختہ مسکرا دیا۔

"مجھے اپنی یہی عادت پسند ہے۔ میری بے بے جی نے یہی سکھایا تھا کہ اپنے کام سے مطلب رکھو۔ دوسروں کی ٹوہ میں نہ رہو۔ جو دوسروں کے کرنے کے کام ہیں۔ وہ انہیں کرنے دو، خوامخواہ دخل اندازی نہ کرو۔ اس طرح اپنی منزل بھی کھوٹی ہو جاتی ہے۔"

مجھے "حیات ہاسپٹل" میں تعینات ہوئے چھ ماہ گزر چکے تھے اور اس دوران بارہا شہباز سمیت دیگر کولیگز سے اپنی سیدھی و شفاف فطرت اور سادہ لوحی کے متعلق تبصرے سن چکا تھا۔

میں جانتا تھا کہ میں نہ بے وقوف ہوں اور نہ بزدل۔ بس اتنا ہے کہ شرارت اور بدلحاظی میری سرشت میں شامل نہیں ہے۔ میں ہر شخص سے حسب مراتب اور حسب روایت احترام روا رکھنے کا قائل ہوں۔ بے جا سرکشی، ضد اور بدتمیزی میری طبیعت پر گراں گزرتی ہے۔

میرے ادب آداب کے یہ طور طریقے میرے ساتھی ڈاکٹرز کو ناپسند تھے۔ مگر میں اپنے حال میں مست و مگن تھا۔

"صاحب جی! آپ کا خط آیا ہے۔" ڈیوٹی کے بعد میں ہاسپٹل سے نکل کر اپنی رہائش گاہ پر آیا تو بے بے جی کا خط میرا منتظر تھا۔ میں بے تابی سے چوکیدار کے ہاتھ سے جھپٹ کر کھولنے لگا۔ خط میرے چھوٹے بھائی اظہر کے ہاتھ سے لکھوایا گیا تھا۔ اظہر اس سال ساتویں کلاس کا امتحان دے رہا تھا۔

"پتر مجو!"

تو تو دوسرے علاقے میں جا کے ماں کو بھول ہی بیٹھا۔ تین ہفتے گزر چلے ہیں، مگر کوئی خط پتر نہیں ملا۔ خط خیال سے ہر ہفتے بھیج دیا کر میرے بچے کہ تیری ماں کی نظریں چوکھٹ پر ہی رہتی ہیں۔ یہ موئے پیٹ کی آگ بھی کتنی ڈھاڈی ہوتی ہے۔ میں دن رات دعائیں کرتی ہوں کہ کسی طرح پنجاب کے کسی ہسپتال میں تیری نوکری لگ جائے۔ طرح طرح کے دھڑکوں سے تو جان چھوٹے۔ اچھا سن پتر! تیری ماسی اختری مجھ سے دو تین بار پوچھ چکی ہے بہانے بہانے سے، وہ کہتی ہے شمیم کے لیے پیام آ رہے ہیں اگر مرضی ہو تو بتا دیں پھر بعد میں گلہ نہ کرنا۔ شمیم آٹھ جماعتیں پاس کر چکی ہے اور اب پرائیویٹ میٹرک کرنے کی تیاری کر رہی ہے۔ ماشاء اللہ بڑی سلیقے طریقے والی سگھڑ اور سوہنی دھنی ہے۔ تو مجھے فٹافٹ اپنا ارادہ لکھ بھیج تاکہ میں اختری سے شمیم کے رشتے کے لیے بات شروع کر دوں۔ تیری چھوٹی بہن ننھی تجھے بہت یاد کرتی ہے۔ تیری آپا صغریٰ بھی پچھلے دنوں اپنے سسرال سے آئی ہوئی تھی۔ اللہ رکھے اپنے گھر میں راضی خوشی ہے۔ اچھا پتر اب اجازت دے۔"

خط پڑھ کر بے اختیار میرے ہونٹوں پر ایک خوب صورت سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ میں نے چاہت سے خط مٹھی میں بھینچ کر آنکھوں سے لگایا جیسے بے بے جی کی خوشبو، ان کا لمس من میں اتارنا چاہتا ہوں۔

میرا تعلق صوبہ پنجاب کے ضلع وہاڑی کے ایک گاؤں کرم پور سے تھا۔ ابتدائی تعلیم گاؤں سے حاصل کرنے کے بعد میں نے شہر سے ایف ایس سی کی اور پھر بہاولپور میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد ہاؤس جاب کے لیے سال بھر خوار ہوتا رہا۔ ملتان کے ایک ہاسپٹل سے ہاؤس جاب مکمل کی تو نوکری ڈھونڈنے کے لیے آزمائش کا ایک دریا عبور کرنا پڑا۔ آج کل تو ڈاکٹرز کی بہتات کا یہ عالم ہے کہ ایک اینٹ اٹھاؤ تو دس ڈاکٹرز نکلتے ہیں۔ آسامیاں کم امیدوار زیادہ اور مقابلہ سخت۔ سو مجھ سمیت بہت سے ڈاکٹرز ہاتھوں میں ڈگریاں پکڑے جوتیاں چٹخا رہے تھے۔

میرا تعلق دوسرے درجے کے زمیندار گھرانے سے تھا۔ والد صاحب کی تھوڑی سی زمین تھی جس پر کھیتی باڑی کر کے سارا کنبہ پل رہا تھا۔ ماں باپ کی امیدوں کا مرکز میری تعلیم کے خاتمے پر ایک شاندار ملازمت کا حصول تھا۔ مگر پے در پے مقصد میں ناکامی نے مجھے کم اور انہیں زیادہ مایوس کیا تھا۔ پر گزشتہ سال

KitabPK.Com

والد صاحب کا بھی انتقال ہو گیا تو ساری ذمہ داری مجھ پر آن پڑی تھی۔

اسی زمانے میں اخبار میں شمالی علاقہ جات میں قائم کیے جانے والے پرائیویٹ ہسپتال کے لیے دو خالی آسامیوں پر ڈاکٹرز کی ضرورت کا اشتہار شائع ہوا۔ رہائش اور کھانے پینے کی سہولیات مفت تھیں اور تنخواہ بھی پرکشش تھی۔ یہ ہاسپٹل وادئ سوات میں مینگورہ شہر سے پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع دیہات اڈیگرام میں خان حیات ابراہیم نے قائم کیا تھا۔

کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔ میں نے اشتہار پڑھ کر قسمت آزمائی کا فیصلہ کر لیا۔ کسی مشہور و معروف بڑے سرکاری ہسپتال میں جاب حاصل کرنے کی زبردست خواہش کو خواب سمجھ کر بھلا دیا اور گھر والوں کی مخالفت کے باوجود پشاور میں واقع خان حیات ابراہیم کی ذاتی کوٹھی پر انٹرویو کے لیے چلا آیا۔ خان صاحب کی فیملی شہر میں رہتی تھی۔ غالباً" بچوں کی اعلیٰ تعلیم کی غرض سے خان حیات ابراہیم نے شہر میں رہائش رکھی تھی۔ مگر ان کی آبائی حویلی اڈیگرام میں ہی تھی۔

ان کی اپنی ایک ہی بیٹی تھی البتہ بھائی کی وفات کے بعد اس کے بیٹے وجاہت کو باپ بن کر پالا تھا۔ وجاہت ڈاکٹری پاس کر کے دو سال لندن میں اسپیشلائز کرنے کے بعد حیات ہاسپٹل کا انتظام سنبھال چکے تھے۔ البتہ بیٹی خیبر میڈیکل کالج میں زیر تعلیم تھی۔

"اتنی دور نہ جاؤ ویر جی! ان پتھروں پہاڑوں میں تو خط پتر بھی نہیں پہنچتے ہوں گے۔ یہ نہ ہو تمہیں ہمارے جینے مرنے کی خبر بھی نہ ملے۔" بے بے جی کے ساتھ ساتھ صغریٰ آپا نے بھی مجھے روکنے کی بہتری کوشش کی تھی۔ مگر مجھے اپنے کندھوں پر پڑی ذمہ داری کا بخوبی احساس تھا۔ میں انہیں بہلا کر چلا آیا۔

خلاف توقع میں بہت جلد اس پہاڑی ماحول کا عادی ہو چکا تھا۔ جب میں نے اپنی پہلی تنخواہ پر آٹھ ہزار کا منی آرڈر بھجوایا تو بے بے جی خوشی سے رو پڑی تھیں۔ یکمشت اتنی بڑی رقم ہاتھ میں آنا خواب لگ رہا تھا۔ پھر یہ سلسلہ باقاعدگی سے شروع ہو گیا۔ میں چار ماہ بعد چھٹی پر گھر گیا تو اماں کچا گھر پکا کروا چکی تھیں اور اب ننھی کے جہیز اور میری ہونے والی دلہن کے لیے بری کی چیزیں جمع کر رہی تھیں۔ میں ان کی دور اندیشی پر کتنی دیر تک ہنستا رہا تھا۔

ننھی ابھی بارہ برس کی کم سن لڑکی تھی۔

"لڑکیاں بڑی ہوتے کون سا دیر لگتی ہے۔" بے بے جی میری ہنسی کا برا مان گئی تھیں۔

"افوہ کن سوچوں میں کھو گیا۔ ابھی بے بے جی کے خط کا جواب لکھنا ہے۔" میں خود کو لتاڑ کر سیدھا ہوا اور قلم کاغذ ڈھونڈنے لگا۔

"بے بے جی! جیسے آپ کی مرضی۔ جو آپ کی پسند ہے وہی میری۔ آپ جانتی ہیں مجھے ایسی باتوں سے دلچسپی نہیں ہے۔ آپ اپنے دل کی کریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اگر آپ کہتی ہیں تو پھر شمیم واقعی اچھی ہو گی۔"

میں نے پوری قلبی آمادگی کے ساتھ تحریر کر دیا اور حقیقتاً" ایسا ہی تھا۔ مجھے عورتوں کے معاملات سے کبھی دلچسپی نہیں رہی، اور سچی بات تو یہ ہے کہ اب تک ایسا مصروف رہا تھا کہ ان باتوں کی طرف دھیان بھی نہیں گیا تھا۔ اس میں سارا کمال بے بے جی کی تربیت کا تھا۔ اب انہوں نے احساس دلایا تو خیال آیا تھا کہ بندے کو زندگی میں شادی بھی کرنا ہوتی ہے۔

......*

صبح اٹھا تو کھڑکی سے باہر نظر پڑتے ہی برف کی سفید چادر سامنے آ گئی۔ رات برف باری ہوئی تھی۔ سارا علاقہ برف سے ڈھک گیا تھا۔

میں دونوں ہاتھ آپس میں مسلتا ہوا خود کو حرارت پہنچانے کی سبیل کر رہا تھا۔

آج میری صبح کی ڈیوٹی نہیں تھی، سو آرام و اطمینان سے منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کر کے لباس تبدیل کیا۔ میرا ارادہ دریا پر جانے کا تھا۔ دریائے سوات اس گاؤں کے پاس سے گزرتا ہے۔ گاؤں کے ارد گرد پھیلے پھلوں کے باغات اور کھیت سب برف پوش ہو چکے تھے۔ مقامی باشندوں سے پتا چلا تھا کہ اڈیگرام کی اپنی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ یہاں تقریباً" ساڑھے نو سو

KitabPK.Com

سال پہلے اوڈی نامی بت پرست قوم آباد تھی۔ پھر محمود غزنوی کے حملے اور قبضے کے بعد اس گاؤں میں بھی مسجدیں تعمیر کی گئیں۔ کچھ عرصہ پہلے محکمہ آثار قدیمہ نے کھدائی کے بعد یہاں ایک پرانی مسجد دریافت کی تھی۔

میں دوپہر تک یہاں وہاں پھرتا رہا۔ یخ بستہ سرد ہوائیں جسم و جاں میں پھریری سی دوڑا دیتی تھیں۔ مگر اب میں یہاں کے رنگ بدلتے موسموں کا عادی ہو چکا تھا۔

تقریباً" دو بجے میں ہاسپٹل کے احاطے میں داخل ہوا تھا۔ ارادہ تھا کہ ہاسپٹل کی کینٹین سے دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد معمول کا کام شروع کروں گا۔

"بات سنیے گا ڈاکٹر صاحب۔" کینٹین کا راستہ سے گزر کر جاتا تھا جونہی رسپشن پر پہنچا۔ اسٹاف میل نرس نے بہ عجلت پکار کر روکا تھا۔

میں مڑ گیا اور سوالیہ نظروں سے ایاز کو دیکھا۔

"وہ خان زادی صاحبہ سروجاہت کے کمرے میں ہیں۔ کہہ رہی تھیں جو بھی ڈاکٹر ملے' اسے فوراً" میرے پاس بھیج دیں۔ کوئی ایمرجنسی آئی ہے۔"

خان زادی کی آمد کے سبب میل نرس کا لہجہ خود بخود مستعد اور مؤدب ہو گیا تھا کہ اس کی سخت گیر فطرت سے سب خوف کھاتے تھے۔ حالانکہ خان وجاہت ابراہیم ہاسپٹل کے ایم ایس تھے۔ مگر ان سے اتنا نہیں ڈرتے تھے جتنا خان زادی شیمل سے' خان وجاہت ہنسوڑ' بے فکری اور لاپرواسی طبیعت کے مالک تھے۔ خوش طبع' خوش باش اور خوش لباس شخص تھے۔ ان کے مقابلے میں خان زادی کی طبیعت میں پر اسرار اور مرعوب کر دینے والی خاموشی' سرد مہری اور انانیت پسندی نمایاں تھی۔ نیک شگون یہ تھا کہ کم از کم وہ خان وجاہت کے ساتھ نرمی اور صلح جوئی سے پیش آتی تھی۔ ورنہ یہ رشتہ کبھی نہ نبھ سکتا۔

یہ ساری باتیں شہباز ہی گاہے بگاہے میرے کانوں میں انڈیلتا رہتا تھا۔ بذات خود میں نے خان فیملی کے معاملات کھوجنے میں کبھی اشتیاق ظاہر نہیں کیا تھا۔

میں نے لنچ پر فاتحہ پڑھ کر خان وجاہت کے کمرے کا رخ کیا۔ دستک کا جواب پا کر اندر داخل ہوا تو سیاہ سمور کے لمبے کوٹ اور سیاہ بڑے سے مفلر میں چہرہ لپیٹے خان زادی کو کمرے میں تنہا پا کر جھجک سا گیا۔

"السلام علیکم۔ آپ نے بلایا تھا؟"

پہلی بار اسے براہ راست مخاطب کیا تھا۔ اس لیے سمجھ میں نہیں آیا کہ کس لقب سے مخاطب کروں۔ میڈم' بی بی' خان زادی یا مس؟ بس یونہی سلام جھاڑ کر ہچکچاتے ہوئے پوچھ ڈالا۔

"آپ یہاں ڈاکٹر ہیں؟"

وہ پلٹ کر میرا جائزہ لے رہی تھی۔

"جی ہاں۔" نظریں ادھر ادھر دوڑاتے ہوئے میں نے سادگی سے جواب دیا۔

"کیا نام ہے آپ کا؟"

"مظہر حسین۔" میں اپنے جوتوں کی ٹو پر نگاہ جما کر آہستگی سے بولا۔

"اوکے مسٹر مظہر۔ آپ فوری طور پر میڈیکل باکس' دو میل نرس اور چیک اپ کا سامان لے کر ساتھ کے گاؤں روانہ ہو جائیں۔ سرجن جمیل بھی ابھی ابھی روانہ ہوئے ہیں۔ ادھر کچھ لوگ زخمی ہو گئے۔ تین مرد ہیں اور ایک عورت' عورت کو فرسٹ ایڈ دینے کے بعد ہاسپٹل لے آئیں۔ میں دیکھ لوں گی۔"

وہ تحکمانہ انداز میں بات مکمل کرنے کے بعد ٹیلی فون پر کوئی نمبر ملانے لگی۔ غالباً" اپنی حویلی بات کر رہی تھی۔

"نواز خیل' گل محمد سے کہو' بابا کی جیپ ہاسپٹل لے آئے۔ ڈاکٹر صاحب کو ڈراپ کرنا ہے۔ وجاہت صاحب کی جیپ کھڈے میں گر کر تباہ ہو گئی ہے اور ہاسپٹل کی گاڑی میں ایک ڈاکٹر پہلے سے روانہ ہو چکے ہیں۔"

اس نے فون رکھ دیا۔

مجھے سخت اچنبھا ہوا۔ خان وجاہت کی جیپ کیسے تباہ ہوئی! اور وہ اس وقت کہاں ہیں؟

"جیپ آتے ہی آپ روانہ ہو جائیے گا۔ بابا جان بھی ادھر ہی ہوں گے۔" میں سر ہلا کر باہر نکلا مگر ذہن

KitabPK.Com

میں ہلچل مچ گئی تھی۔ خان زادی کے لب و لہجے سے تشویش اور پریشانی ٹپک رہی تھی۔

*_*_*

یہ عقدہ دو تین روز بعد خود بخود حل ہو گیا۔

ساتھ کے گاؤں میں خان حیات ابراہیم کے مخالف قبیلے سردار دونوں قبیلے پشتوں سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے چلے آرہے تھے۔ تین روز قبل خان وجاہت جیپ پر اپنے آدمیوں کے ساتھ ہنگورہ شہر سے واپس گاؤں کی طرف آرہے تھے کہ راستے میں شمشیر خٹک کے قبیلے کی ایک الھڑ نار پر نگاہ پڑی۔ وہ جیپ روک کر لڑکی کے پاس آگئے اور یونہی چھیڑ خانی شروع کر دی، وہ لڑکی کو جیپ میں ڈال کر اپنے ہمراہ لے جانا چاہتے تھے مگر لڑکی نے واویلا مچا دیا جس پر اس کے قبیلے کے تین چار بندے جمع ہو گئے۔ صورت حال دیکھ کر وہ بپھر گئے اور خان وجاہت کے بندوں پر گولیاں چلا دیں۔ اس فائرنگ کے نتیجے میں خان وجاہت کا ایک بندہ اور مخالفین کے دو بندے شدید زخمی ہوئے۔ حملے کے دوران ایک گولی لڑکی کے سینے میں پیوست ہو گئی تھی۔

زخمیوں کو فوری امداد کے بعد ہاسپٹل میں لایا گیا۔ تینوں مرد تو کسی طرح بچ گئے۔ مگر لڑکی زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے دوسرے دن چل بسی۔ وہ سردار شمشیر خٹک کی سگی بھانجی تھی۔ یہ قتل کوئی معمولی قتل نہیں تھا۔ اگر جرگے والے بیچ بچاؤ نہ کرتے تو دونوں قبیلوں میں ہولناک جنگ چھڑنے کا امکان تھا۔

خان زادوں اور سردار زادوں کی رنگین مزاجی کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ لیکن یہاں معاملہ مخالف قبیلے کا تھا اور وہ بھی سردار کی بھانجی کا۔

*_*_*

"کیا ہو رہا ہے جناب۔" شہباز کامن روم میں داخل ہوتے ہوئے حسب معمول چہکا۔ میں مڑ کر دھیرے سے مسکرا دیا۔

"ادھر خان کی حویلی میں تو طوفان اٹھ کھڑا ہوا ہے۔"

"کیوں خیریت۔"

میں فائل بند کر کے کرسی پر آبیٹھا۔

"جرگے نے فیصلہ سنا دیا ہے۔ جس پر پندرہ روز کے اندر اندر عمل درآمد ہونا لازم ہے۔"

"کیسا فیصلہ۔" میں خان وجاہت والے کیس کو بھول بھال چکا تھا۔

"جان کے بدلے جان کے اصول کے تحت انہوں نے خان زادی شمیل کو سردار شمشیر خٹک کے حوالے کرنے کا حکم صادر کیا ہے۔"

میرے سر پر جیسے چھت آن رہی۔

"کیا۔"

"انہیں خان کی حویلی سے عورت چاہیے۔ چاہے وہ خان ابراہیم کی بیٹی ہو، بہن ہو یا خان وجاہت کی بیوی۔"

"اوہ۔" میں اس اچانک جھٹکے سے سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کہاں وہ پچاس سالہ بڈھا سردار شمشیر خٹک اور کہاں خان زادی شمیل جیسی گلبدن۔ سچ سچ خدا بھی کیسے کیسے لوگوں کو نوازتا ہے حسن کا انمول خزانہ۔"

شہباز اپنے مخصوص انداز میں ہانک رہا تھا مگر میرا ذہن کسی اور ہی خیال کے تانے بانے بن رہا تھا۔ موجودہ صورت حال میں اگر خان زادی کا نکاح خان وجاہت سے پڑھا دیا جائے تب بھی وہ جرگے کے قانون کے مطابق سردار شمشیر خٹک کی تحویل میں جانے سے نہیں بچ سکتی تھی۔ کیونکہ اس طرح وہ خان وجاہت کی بیوی ہونے کے ناتے فیصلے کی رو سے مخالف قبیلے کے سپرد کر دی جاتی۔

"کیا کوئی اور راستہ نہیں نکلتا ان کے قوانین میں۔" میں یونہی اپنی معلومات کی غرض سے شہباز سے پوچھنے لگا۔

"ہوتا ہے۔ اگر مخالف قبیلہ راضی ہو جائے یا "بازو" میں دینے کے لیے لڑکی نہ ہو تو قصوروار قبیلے سے ایک خطیر رقم کے بدلے سمجھوتا طے پا جاتا ہے۔ رقم دے کر حساب بے باق کر دیا جاتا ہے۔ مگر یہاں اس صورت حال سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ لڑکی موجود ہے۔"

KitabPK.Com

*_*_*

اس فیصلے کے تقریباً" بارہ دن بعد اچانک ہی مجھے خان کی حویلی میں طلب کر لیا گیا ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ ورنہ میری دوڑ بس ہسپتال سے رہائشی مکان اور وہاں سے دریا کے کنارے تک تھی۔

ملازم مجھے براہ راست خان حیات کے پر شکوہ بیڈ روم میں لے آیا تھا۔ خان وجاہت بھی وہیں موجود تھے۔

"السلام علیکم خان جی۔" بڑے خان کو دیکھ کر میرا دل خود بخود مؤدب و مرعوب ہو کر تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔ وہ سفید شلوار قمیص اور سیاہ واسکٹ میں اونچے شملے والی پر شکوہ پگڑی باندھے سر جھکائے شکستہ خوردہ سے ساگوان کے پلنگ پر ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ان کے سرخ و سفید چہرے پر مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا وہ اپنی اکلوتی اولاد خان زادی شمیل سے بے انتہا پیار کرتے تھے۔ اسی لیے قبیلے کی روایات کے برعکس بیٹی ہونے کے باوجود اسے اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی اور ڈاکٹری مکمل ہونے تک اپنے آبائی گاؤں سے میلوں دور شہر میں رہائش کا انتظام کیا تھا۔

"ادھر آ کر بیٹھو مظہر! ہمیں تم سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔" خان حیات نے بیڈ کے سرہانے بہت قریب رکھی کرسی کی سمت اشارہ کیا تو میں جھجک سا گیا۔

"ہم ابھی آتے ہیں خان بابا۔" نجانے خان وجاہت کو کیا سوجھی کہ ایک دم اٹھ کر باہر چلے گئے۔

"تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔" میں کچھ جھجک کر کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

"نہیں خان جی۔" میں چپ چاپ اگلی بات کا منتظر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"وجاہت دیکھنے میں لاپروا ہے مگر کام کا دھنی ہے۔ ہسپتال کے ایک ایک بندے پر نظر رکھتا ہے اور ہمیں باقاعدگی سے رپورٹ دیتا ہے تمہاری ایمانداری، سادگی، شرافت اور فرض شناسی کی اکثر ہی تعریف کرتا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہمارا انتخاب غلط ثابت نہیں ہوا۔ تم نے عملاً" بتا دیا ہے کہ تم اس جاب کے سب سے زیادہ اہل تھے۔"

میں ورطۂ حیرت میں گم ان کے منہ سے نکلنے والے توصیفی کلمات سن رہا تھا۔

"اگر ہم اپنا ذاتی کام تمہارے سپرد کریں تو کیا تم اسی ایمانداری فرض شناسی اور شرافت سے پورا کرنے کی ضمانت دے سکتے ہو؟"

"آپ حکم کیجئے خان جی۔" ان کے پر اسرار انداز میرے لیے الجھن پیدا کر رہے تھے۔

"اگر ہم کچھ عرصے کے لیے اپنی بیٹی شمیل تمہارے سپرد کر دیں شرعی نکاح کے کاغذات کے ہمراہ تو کیا تم اسی ایمانداری اور شرافت سے کچھ عرصے بعد دوبارہ ہمیں واپس کر سکتے ہو؟" وہ سیدھا میری آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔

جیسے کہیں سات سمندر بپھرے ہوئے طوفان بن کر آپس میں ٹکرائے تھے۔

"جی۔" میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ ایک لمحے کو یوں ہونق بن کر انہیں دیکھا جیسے وہ مذاق کر رہے ہوں۔

خان حیات کا چہرہ صدیوں کا ضعیف اور نقاہت زدہ لگ رہا تھا۔ ان کا سر جھکا ہوا تھا اور رنگت تانبے کی طرح تمتما اٹھی تھی۔ یقیناً" غیرت و حمیت کا کڑا امتحان پاس کر کے یہ تجویز نوک زبان پر لائے تھے۔

"ہمیں اپنے دونوں بچوں کی خوشی عزیز ہے۔ ہم بچپن کے اس بندھن کو ختم کر کے اپنی بچی کو درندوں کے حوالے نہیں کر سکتے۔ آج بارہ دن گزر چکے ہیں۔ صرف تین دن باقی ہیں اس کے بعد کوئی پتا ہمارے ہاتھ میں نہیں رہے گا۔ ہم نے خان وجاہت کے ساتھ سر جوڑ کر مغز ماری کے بعد یہ ترکیب نکالی ہے کہ کسی طرح عارضی مدت کے لیے شمیل کو اس علاقے سے غائب کر دیا جائے اور گاؤں میں یہی مشہور کرایا جائے کہ وہ کسی کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔ اس طرح مخالفین دو تین ہفتے ادھر ادھر جھک مارنے کے بعد مقدمہ نپٹانے کے لیے رقم کی ادائیگی پر راضی ہو جائیں گے اور جب یہ معاملہ حل ہو جائے تو اس کے بعد طلاق دلوا کر اسے خان وجاہت سے بیاہ دیا جائے۔"

KitabPK.Com

میں کمرے میں موجود ہوتے ہوئے بھی خود کو غیر حاضر محسوس کر رہا تھا۔ میرا وجود کسی خلا میں تیرتے سیارے کی طرح ادھر ادھر بھٹک رہا تھا۔

"اس مقصد کے لیے ہم نے بہت سوچ بچار کے بعد تمہارا انتخاب کیا ہے۔ تم بھروسے کے آدمی ہو۔ شریف اور بہادر ہو۔ ہمیں یقین ہے کہ تم خان زادی کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کرو گے۔ میں چاہتا ہوں۔ تم لوگ اس علاقے سے نکل کر مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے دوسرے صوبے میں داخل ہو جاؤ۔ صوبہ پنجاب کا کوئی پسماندہ سا گاؤں زیادہ مناسب رہے گا۔ پنجاب جیسے گنجان آباد اور زرعی و صنعتی صوبے میں کسی بندے کو تلاش کرنا بہت دشوار ہے۔ سیدھے سفر مت کرنا۔ ادھر ادھر بھی کسی قصبے، کسی شہر یا دیہات میں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھنا تاکہ تعاقب کرنے والے دھوکے میں آکر تم لوگوں کا سراغ کھو بیٹھیں۔ آخری منزل تمہارا اپنا گاؤں ہو گی۔ مگر خبردار سیدھے ادھر مت جانا کیونکہ سردار شمشیر خٹک تمہارے ہمراہ فرار کی خبر سن کر سب سے پہلے تمہارے آبائی گاؤں کی طرف بندے دوڑائے گا۔"

مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں، خان حیات ابراہیم اور ان کے الفاظ کسی طویل خواب کا حصہ ہیں۔ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ کس سے کہہ رہے تھے اور کیوں کہہ رہے تھے۔ میں سوچنا نہیں چاہتا تھا مگر میری سماعتیں سن ہو رہی تھیں۔

"خان جی! آپ میرے محسن ہیں۔ اگر آپ کے خاندان پر کوئی برا وقت آیا ہے تو میں مقدور بھر خدمات پیش کرنے کے لیے سر کے بل تیار ہوں۔ مقصد خان زادی کو رازداری و ذمہ داری سے کسی محفوظ مقام پر پہنچانا ہے تو میں ان کی حفاظت کا بیڑا اٹھاتا ہوں لیکن ان سے نکاح کی گستاخی مجھ سے نہیں ہو سکے گی۔"

بڑی تگ و دو کے بعد اپنی ہمت مجتمع کرتے ہوئے میں نے گھٹے گھٹے لہجے میں سر جھکا کر آہستگی سے کہا تھا۔

"خود خان زادی اور خان وجاہت بھی اس حق میں نہیں ہیں، مگر نکاح کرنا مجبوری ہے۔ اس کی دو اہم وجوہات ہیں۔" وہ سرد مہری سے گویا ہوئے۔

"میں اپنے قبیلے کا سردار ہوں اور ہماری روایت ہے کہ جو لڑکی گھر سے بھاگ جائے اس کی بازیافت ہونے یا لوٹ آنے پر اس کی سزا موت ہوتی ہے۔ ہاں اگر وہ جس کے ساتھ فرار ہوئی ہے۔ اس سے نکاح کر چکی ہو تو اس صورت میں اسے زندہ رکھا جاتا ہے اور اس کا معاملہ قبیلے کے سردار کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اگر سردار چاہے تو دونوں کا نکاح فسخ کروا کے لڑکی کو اپنے قبیلے کے کسی بندے سے بیاہ سکتا ہے اور اگر لڑکا لڑکی طلاق پر راضی نہ ہوں تو لڑکی کو قبیلے سے خارج کر دیا جاتا ہے اور دونوں میاں بیوی کو ہمیشہ کے لیے اس علاقے سے بے دخل کر دیا جاتا ہے۔ انہیں تاعمر یہ اجازت نہیں ہوتی کہ دوبارہ اس جگہ قدم رکھ سکیں۔"

"اوہ۔" میں نے اضطراری انداز میں مٹھیاں بھینچ لیں۔

"اس لیے جب تک نکاح نامے کی کاپی ہمارے پاس نہیں ہو گی، قبیلے والے خان زادی کی واپسی کو قبول نہیں کریں گے۔ دوسری صورت یہ بھی ہے کہ تم لوگ جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرو گے۔ کسی ہوٹل یا سڑک پر چیکنگ کے دوران مشکوک جوڑا سمجھ کر پولیس تمہیں دھر لے گی، ادھر میدانی علاقوں میں بڑے سخت قانون ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کبھی تم لوگوں کو کسی کے ہاں پناہ لینی پڑے۔ اس صورت میں شرعی رشتے کا ثبوت لازم ٹھہرے گا۔"

خان حیات ابراہیم بلا کے دور اندیش تھے۔ مجھے افسوس ہوا بھلا اتنے فہم و فراست والے متحمل مزاج شخص کا بھتیجا اتنا ناعاقبت اندیش کیسے بن گیا کہ بے سوچے سمجھے مخالف قبیلے کی لڑکی پر ہاتھ ڈال دیا۔

"میں تمہیں آج رات کی مہلت دیتا ہوں۔ کل صبح مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دینا۔" ان کی تیز نظریں میرے چہرے پر پھیلی کشمکش کی لکیریں بھانپ چکی تھیں۔

"لیکن خیال رہے۔ اس کمرے کی کوئی بات دوسرے کان تک نہیں پہنچنی چاہیے۔" کل شام

KitabPK.Com

نکاح کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد جب میں کچھ ضروری سامان کے ہمراہ تم خان زادی کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ گے۔ نکاح نامے کی ایک کاپی ہمارے پاس رہے گی۔ ہم اگلے دن اس فرار کی خبر عام کر دیں گے اور شمشیر خنک سے ہم لاعلمی اور غم و غصے کا اظہار کریں گے۔ اسے یہ بھنک نہیں پڑنے دیں گے کہ اس فرار کے پیچھے ہمارا ہاتھ ہے۔ وہ پاگلوں کی طرح تم لوگوں کو ڈھونڈے گا۔ بالآخر پندرہ بیس دن بعد ناکام ہو کر ٹھنڈا پڑ جائے گا اور ہم سے خطیر رقم کے عوض معاملہ نپٹانے کا مطالبہ کرے گا۔ اس کے دو ہفتوں بعد ہمارا بندہ تمہارے آبائی گاؤں آ کر تمہیں مطلع کرے گا اور یوں تم خان زادی کو لے کر "ڈیگرام آجاؤ گے چونکہ سردار شمشیر خنک رقم لے کر معاملہ طے کر چکا ہو گا۔ اس لیے خان زادی کی بازیافت پر اس کا حقدار نہیں بن سکے گا۔"

یا اللہ کیسے گورکھ دھندے ہوتے ہیں یہ قبائلی قوانین و ضوابط صد شکر کہ میرے جیسا سیدھا سادا بندہ یہاں کی پیداوار نہیں تھا۔ ورنہ میں تو اب تک کسی گولی کا نشانہ بن کر اس دنیا کو داغ مفارقت دے چکا ہوتا۔

میں حویلی سے باہر آگیا تھا۔

وہ رات میرے لیے کانٹوں کا بستر بن گئی۔

دماغ چک پھیریاں کھا رہا تھا۔ اعصاب سنسنی خیز ہیجانی کیفیت سے دوچار تھے۔ بدن جیسے سن ہو کر رہ گیا تھا۔

کہاں خان زادی شیمل جیسی دلکشی و تمکنت سے بھرپور ساحرہ اور کہاں مجھ جیسا عام سا سانولا سلونا سیدھا سادا دیہاتی بندہ وہ مالک تھی اور میں کمتر سا ملازم۔ کوئی میل ہی نہیں بنتا تھا۔ پھر خان وجاہت جیسے حسین و جمیل خوبرو شہزادے جیسی آن بان رکھنے والے منگیتر کی مثل آفتاب روشن و دلاویز شخصیت کے سامنے تو میری شخصیت بری طرح دب کے رہ جاتی تھی۔

خان زادی اور خان وجاہت ابراہیم ایک دوسرے کو دل سے پسند کرتے تھے۔ ان میں محبت اور یگانگت کا رشتہ تھا۔

میری تو "کاغذی" گنجائش بھی نہیں نکلتی تھی کجا جائیکہ ایک ڈیڑھ ماہ کی مستقل رفاقت۔

کاش خان جی نے رازداری کی مہر نہ لگائی ہوتی تو میں "فوراً" سے پیشتر شہباز کو ساری صورت حال واضح کر کے مشورہ طلب کر لیتا۔

میں پیشانی مسلتا ہوا کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

خان حیات ابراہیم نے جس تحکم اور تاکید سے گفتگو کی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے طور پر مجھے مکمل طور پر اس منصوبے پر عمل درآمد کرنے کے لیے منتخب کر چکے ہیں اور مجھ سے انکار کی ہرگز بھی توقع نہیں رکھتے۔

"کیا میں ہامی بھر لوں۔ مگر ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی تو میں نے بے جی کو شمیم کے لیے ہاں کی ہے۔" میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔

"ہونہہ بے وقوفا! یہ کون سا مستقل رشتہ ہو گا۔ خان زادی اس کاغذ کے ٹکڑے سے تیری بیوی نہیں بن جائے گی۔ جو فاصلے ہیں' وہ جوں کے توں برقرار رہیں گے۔"

مجھے کچھ سکون سا محسوس ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ بے جوڑ اور انمل سا عارضی تعلق مجھے بہت چبھ رہا تھا اگر خان حیات ابراہیم نے نکاح نامے کی اہمیت پر روشنی نہ ڈالی ہوتی تو میں بخوشی خان زادی کی ذمہ داری قبول کر لیتا۔

*_*_*

اگلی صبح بڑی عجیب اور سنسنی خیز تھی۔ میں خان حیات ابراہیم کی حویلی پہنچ کر اپنی فرمانبرداری کا ثبوت "ہاں" کی صورت پیش کر چکا تھا۔

نکاح کی کارروائی بڑی رازداری سے بند کمرے میں مکمل کی گئی۔

"خان جی! فقط ایک تشویش ہے۔ میرے جانے کے بعد گاؤں سے بے بے جی کے خط آئیں گے۔ ان کا جواب کون دے گا اور اگر کوئی ایمرجنسی ہوئی اور مجھے گھر جانا پڑا تو اس کی مجھے کیسے اطلاع ہو گی۔"

"بے فکر رہو۔ تمہارے خط ہم سنبھال کر رکھیں

KitabPK.Com

گے۔ تم اپنے گھر والوں کی تسلی کے لیے ابھی روانہ ہونے سے پہلے ایک خط لکھ دو کہ میں ہسپتال کے کام سے عملے کے ساتھ ایک ڈیڑھ ماہ کے لیے مختلف علاقوں کے دورے پر جارہا ہوں' واپسی پر خود خط لکھ کر رابطہ کروں گا۔ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔"

خان حیات ابراہیم کا آئیڈیا نہایت مناسب تھا۔ میں نے جلدی جلدی خط لکھ کر ان کے ایک ملازم سے لفافہ منگوا کر اس سے پوسٹ کروادیا۔

"جیپ کے پٹرول اور خرچے پانی کے لیے یہ رقم رکھ لو۔" خان جی نے چمڑے کے ایک چھوٹے سے تھیلے نما بیگ میں تقریباً" ساٹھ ہزار روپے ٹھونسنے کے بعد اسے بند کردیا۔

"میرا خیال ہے کافی رہے گی۔ اگر ناگہاں مزید کی ضرورت ہوئی تو کہیں سے فون کردینا۔ میں بندہ بھیج کر رقم پہنچادوں گا۔ اس بیگ کی باہر والی جیب کے اندر اعشاریہ بتیس بور کا ایک ریوالور اور گولیوں کے دو میگزین موجود ہیں۔ جان و مال کی حفاظت کے لیے ہتھیار کا ہونا لازمی ہے۔ ایک جیپ تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔ جیپ کی بدولت ناہموار اور پتھریلے پہاڑی راستوں پر ڈرائیونگ کے لیے آسانی رہے گی۔"

وہ اپنے طور پر تمام انتظامات مکمل کرچکے تھے۔ اسی دوران خان وجاہت کمرے میں آگئے۔

"شمیل کو جیپ میں بٹھادیا گیا ہے بابا جان۔" میں نے مڑ کر چوری سے ان کی صورت دیکھی۔ چہرے پر مضطربانہ سرخ رنگوں کی شدت ظاہر کررہی تھی کہ یہ گھڑیاں ان کے لیے حد درجہ کٹھن اور ناقابل برداشت ہیں۔ اپنی منگیتر کو' اپنی چاہت کو اپنے ہاتھوں سے پرائے شخص کو سونپ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں وحشت کی لالی تیر رہی تھی۔

"ایک بات یاد رکھنا ڈاکٹر مظہر۔ ہم لوگ امانت میں خیانت کرنے والے شخص کو بڑی بھیانک سزا دیتے ہیں۔" خان حیات کمرے سے نکل گئے تھے اور اب میں اور خان وجاہت تنہا تھے۔ خان وجاہت کا سرد اور بھنچا ہوا لہجہ مجھے بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔

"آپ خوامخواہ کے واہموں اور اندیشوں کو دل میں جگہ نہ دیں سر۔" میں نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مضبوطی سے کہا۔

"میرے لیے خان زادی اتنی ہی غیر اور محترم ہیں جتنا اس کاغذی تعلق سے پہلے تھیں۔ رشتے کی نوعیت قلبی احساسات کے بدلنے پر منحصر ہوتی ہے۔ اس نام نہاد بندھن کا میرے ایمان پر کیا اثر ہو سکتا ہے۔ یوں بھی میری بے بے جی میری بات کہیں اور طے کرچکی ہیں۔"

"مجھے تم پر اعتماد ہے مگر بہرحال تم بندہ بشر ہو۔ اس لیے احتیاطاً" باور کرایا ہے۔" وہ قدرے مطمئن ہو کر بولے۔

"میرے ایمان کی جڑیں اتنی کمزور نہیں ہیں سر۔" میرا لہجہ بے اختیار استہزائیہ ہوگیا۔ "عورت کبھی بھی میرا مسئلہ نہیں رہی۔ میں ان چیزوں سے دور بھاگتا ہوں۔"

خان زادی شمیل جیپ کی پچھلی سیٹ پر سیاہ گرم چادر میں لپٹی باپ سے الوداعی ملاقات کررہی تھی۔ خان حیات ابراہیم کافی دیر تک مجھے راستوں کے متعلق گائیڈ کرتے رہے۔ پھر اللہ کا نام لے کر میں جیپ میں سوار ہوگیا۔ بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیشانی چومتے ہوئے ان کی آنکھیں بے ساختہ چھلک پڑی تھیں۔

"ہماری امانت کا خیال رکھنا مظہر۔" ذمہ داری کا کڑا امتحان میرے کندھوں پر آچکا تھا۔

*_*_*

ہم عصر کی اذانوں کے ساتھ حویلی سے چل پڑے تھے اور اب مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ تقریباً" ڈیڑھ گھنٹے کا سفر طے ہوچکا تھا اور ابھی نہ جانے کتنا مزید باقی تھا۔ میں خاموشی اور توجہ سے ڈرائیونگ کررہا تھا۔ پیچھے دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

سڑک کے دونوں اطراف سفیدے کے سیدھے اور بلند و بالا درخت میلوں تک ساتھ ساتھ رہے پھر جیپ اس سڑک سے علیحدہ ہو کر مڑ گئی۔

اب دائیں جانب پہاڑوں کے لامتناہی سلسلے نظر آ

KitabPK.Com

رہے تھے۔ بائیں ہاتھ 'باغات' کھیت اور چراگاہیں تھیں۔ مخملیں گھاس کی چادر اوڑھے سرسبز میدان آنکھوں کو تراوٹ بخش رہے تھے۔ دریائے سوات اژدھے کی طرح بل کھاتا دور نشیب میں بہہ رہا تھا سورج غروب ہونے کے بعد اطراف کے مناظر دھند اور تاریکی کے غلاف میں ڈوبنے لگے تھے۔ سڑک تنگ' پیچ دار اور ڈھلوانی تھی۔ یہ پہاڑی گزرگاہ تھی اور سطح زمین سے سینکڑوں بلکہ شاید ہزاروں فٹ کی اونچائی پر واقع تھی۔ ایسی خطرناک سڑکوں پر تو لوگ تجربہ کار ڈرائیور کو ہمراہ لے کر آتے ہیں۔

گو کہ میں ڈرائیونگ میں ماہر تھا۔ لیکن رات کے وقت انجان پہاڑی راستوں پر جیپ دوڑانا سراسر خودکشی کے برابر تھا۔ یہاں اسٹریٹ لائٹس کی سہولت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سرد ہوائیں ونڈ اسکرین پر جم کر سفید باریک سی برفیلی تہہ کی شکل میں اپنے نشانات ثبت کر رہی تھیں۔

"کیا کیا جائے؟" سڑک مسلسل چڑھائی کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے اسپیڈ بہت ہی کم رکھی تھی یوں لگتا تھا جیسے کسی پہاڑ پر چڑھ رہے ہوں۔

ہمیں رات تک وادی عبور کر کے مالاکنڈ پہنچنا تھا مگر اب ناممکن لگ رہا تھا۔ میں تاریکی میں اتنے پر پیچ راستوں پر ڈرائیونگ نہیں کر سکتا تھا۔

سڑک کے ساتھ ساتھ کچھ فاصلے پر چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد تھے۔ جگہ جگہ گوبر کے ڈھیر لگے تھے۔ جن پر مرغیاں ٹھونگ رہی تھیں گھروں کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی نالیوں میں دریائے سوات سے کٹی ہوئی لہر کا میٹھا پانی سانسیں لے رہا تھا۔ نالیوں کے دائیں بائیں مختلف پودوں کی جھالریں پھیل گئی تھیں اور ان میں چھوٹے چھوٹے بنفشی پھول کھلے ہوئے تھے۔

جب راستہ مکمل اندھیرے میں چھپ گیا تو میں نے جیپ کچے پر اتار کر ایک گاؤں کی طرف موڑ دی۔ پھر کچھ فاصلے پر لے جا کر روکی اور اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھ کر کچھ سوچنے لگا۔

"کیا وادی کے لوگ اتنے مہمان نواز ہیں کہ دو اجنبی لوگوں کو رات بھر ٹھہرانے پر تیار ہو جائیں گے۔"

میری سوچ کا محور یہی نکتہ تھا۔

"کیا مسئلہ ہو گیا ہے؟" جب جیپ بند کرنے کے بعد دس منٹ تک میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا تو پیچھے بیٹھی خان زادی شہمل بادل نخواستہ مخاطب ہوئی۔ اس کے لہجے میں مخصوص جلال اور دھمک کے بجائے خلاف توقع خوف' جھجک اور پریشانی تھی۔

"اندھیرے میں سفر جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ اس لیے گاؤں کے کسی مہربان شخص کا دروازہ کھٹکھٹانے کا ارادہ باندھ رہا ہوں۔ آپ مشورہ دیجئے۔ کیا یہاں کے مقامی لوگ اجنبیوں کی مہمان داری کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں؟"

میں بغیر پیچھے مڑے آہستگی سے گویا ہوا۔

"جی ہاں' وہ اسے اپنے لیے سعادت سمجھتے ہیں۔" اس نے مختصراً جواب دیا۔

میں جیپ سے نیچے اتر آیا۔ ایک کسان اپنی بھیڑ بکریوں کو ہانکتا ہوا کندھے پر سبز چارے کی گانٹھ رکھے جیپ کے پاس سے گزر رہا تھا۔ میں نے اسے روک لیا۔ وہ درمیانی عمر کا جفاکش آدمی تھا۔

"بھائی صاحب! ہم لوگ سیاح ہیں۔ آپ کے علاقے میں سیر و تفریح کے لیے کراچی سے آئے ہیں۔ راستے میں رات ہو گئی۔ ان خطرناک راستوں پر سفر کرتے ہوئے شہر کے ہوٹل تک پہنچنا مشکل ہے۔ رات بسر کرنے کے لیے کسی ٹھکانے کی تلاش ہے کیا آپ ہماری مدد کر سکتے ہیں؟"

میں نے مصلحتاً "سیاحت اور کراچی کا حوالہ دیا تھا۔ تاکہ اگر خبر ہو جانے کے بعد شمشیر خٹک کے آدمی پوچھ گچھ کرتے ہوئے کل اس گاؤں سے گزریں تو ہمارا کھوج پا کر تعاقب میں نہ آئیں۔

"صاب! ہمارا غریب خانہ حاضر ہے۔ آپ کے ساتھ کتنے بندے ہیں۔"

"میرے ساتھ میری بیوی ہے۔ بس۔" یہ کہتے ہوئے غیر شعوری طور پر میری رنگت تمتما گئی تھی۔

"میں گلباز ہوں جی یہ سامنے ہی میرا گھر ہے۔ آپ

KitabPK.Com

اندر آئیں۔" میں جیپ کی طرف پلٹا۔ اس نے شیشہ نیچے کر کے سر قدرے کھڑکی سے باہر نکال لیا۔ وہ سیاہ اونی شال پیشانی تک اوڑھے ہوئے تھی۔ سرد برفیلی ہواؤں کے تھپیڑے نے اس کے سفید و گلابی مخملیں گالوں کو سرخ قندھاری انار بنا دیا تھا۔ اس کی ہلکی بھوری بڑی بڑی آنکھوں میں بے چینی اور اضطراب تھا۔

میں نے غالباً" پہلی مرتبہ براہ راست اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔

"آیئے بی بی۔ رات ٹھہرنے کا بندوبست ہو گیا ہے۔" میں نے اس کی طرف کا دروازہ کھول دیا۔

میں نے مختصراً" اسے بتا دیا کہ کیا جھوٹ بولنا ہے۔ اس کی پیشانی پر لکیریں پڑ گئیں تاہم وہ خاموش رہی۔

جیپ لاک کر کے پانی کی نالیاں عبور کرتے ہوئے ہم گلباز کے مٹی سے لیے چھوٹے سے گھر میں داخل ہو گئے۔ یہ دو کمروں ایک صحن اور چھوٹے سے باورچی خانے پر مشتمل سادا سا گھر تھا۔ خان زادی شیمل کو گلباز کی بیوی اور ماں دوسرے کمرے میں لے گئی تھیں۔

"ارے گلباز! تم نے اتنا تکلف کیوں کیا۔ بھائی ہم مسافر لوگ ہیں۔ بس ایک رات کی پناہ چاہیے تھی۔" بھنی ہوئی مرغی کے ساتھ تنوری روٹیاں دیکھ کر میں نے کہا۔

"جو تم لوگ کھاتے ہو، وہی دے دینا تھا۔"

"صاب! ہم تو روٹی پر پیاز یا چٹنی لگا کر کھانے والے لوگ ہیں۔" وہ عاجزی سے بولا۔

"تو کیا ہوا۔ ہم بھی وہی کھا لیتے۔"

"نہیں صاب۔ مہمان کے ساتھ ہم ایسا سلوک نہیں کر سکتے یہ ہماری غیرت کا مسئلہ ہے۔"

کھانا بے حد لذیذ تھا۔ کمرے میں انگیٹھی پر کوئلے دہک رہے تھے۔ جس کی وجہ سے ہم سرد شوریدہ ہواؤں کی یخ بستگی سے محفوظ تھے۔

کھانا کھانے کے بعد میں گلباز کے بچھائے ہوئے بستر پر لیٹ گیا۔ میرے ساتھ والی چارپائی پر گلباز سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ خان زادی شیمل ساتھ والے کمرے میں عورتوں کے ساتھ سوئی تھی۔

صبح ناشتے کے بعد ہم نے رخت سفر باندھ لیا۔

جاتے ہوئے میں نے زبردستی پانچ سو کا نوٹ گلباز کے چھوٹے بچے کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ گلباز منع ہی کرتا رہ گیا۔ اس گھر کے مکینوں کے بے لوث خلوص اور خدمت نے میرا دل موہ لیا تھا۔

سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم مالا کنڈ پہنچ گئے۔ یہاں مالا کنڈ ایجنسی کے دفاتر کے علاوہ کھانے پینے کی چیزوں کی دکانیں اور ریسٹورنٹ وغیرہ تھے۔ یہ خوبصورت، پرسکون اور پر فضا جگہ تھی۔

دوپہر کا وقت تھا۔ میں نے جیپ روک دی۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔

"آپ کھانا گاڑی میں کھائیں گی یا ہوٹل تک چلیں گی؟" میں نے ہلکا سا سر خم کر کے پیچھے دیکھا۔

وہ سیٹ سے ٹیک لگائے تھکے تھکے انداز میں کھڑکی سے اطراف کے مناظر دیکھ رہی تھی۔ میرے سوال پر چونک کر سیدھی ہو گئی۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس کے لہجے میں اجنبیت اور خشکی تھی۔ میں ایک لمحے کو چپ سا ہو گیا۔

"خدا جانے آگے کھانے پینے کی چیزیں ملیں یا نہ ملیں۔ میں پیک کروا لاتا ہوں۔ جب بھوک محسوس ہو، لے لیجئے گا۔"

میں نیچے اتر آیا۔ ایک اوپن ایر چھوٹے سے ہوٹل سے نان کباب لیے۔ خود وہیں بیٹھ کر کھایا۔ اس کے لیے پیک کروا لیا۔

چائے پی کر میں نے جیپ کا انجن چیک کیا۔ ریڈی ایٹر میں پانی ڈالا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ مالا کنڈ کے اطراف کے پہاڑ بے آب و گیاہ، خشک اور سنگلاخ تھے۔ ان کا رنگ گہرا بھورا تھا۔ ان چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔

اب اگلی منزل تخت بھائی اور سنی کوٹ سے گزر کر مردان تھی جس کے بعد نوشہرہ اور اٹک تک کا سفر ہموار کھلی ہائی وے کے ذریعے طے کیا جانا تھا۔ اصل

KitabPK.Com

معرکہ ان پہاڑوں کے درمیان سے گزرتی خوفناک سڑک پر ڈرائیونگ کا تھا۔ اس کے بعد میں ریلیکس ہو کر سفر جاری رکھ سکتا تھا۔ شام تک ہم مردان پہنچ گئے۔

"دی لینڈ آف شوگر اینڈ تمباکو۔" مردان میونسپلٹی کا ایک بورڈ اس کی تصدیق کر رہا تھا۔

مسلسل ڈرائیونگ نے مجھے تھکا دیا تھا۔ مگر آرام کا سوچنا بھی اس وقت ناممکن تھا۔ ہمارے فرار کی سردار شمشیر خٹک کو اطلاع مل چکی ہوگی اور اس کے بندے کتوں کی طرح ہماری بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔ اسی خدشے کے پیش نظر میں جیپ چلاتے ہوئے بار بار بیک مرر سے پیچھے آنے والی گاڑیوں پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ جوں ہی کوئی مشکوک جیپ نظر آتی۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگتا۔

نوشہرہ تک پہنچتے پہنچتے اندھیرا چھا گیا۔

اٹک کا پل پار کرنے کے بعد جی ٹی روڈ کے ذریعے راولپنڈی تک پہنچنا میرا ہدف تھا۔ اور مجھے ڈر تھا کہیں بھٹک کر دشمنوں کے ہتھے نہ چڑھ جاؤں۔ اب میں ریش ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اٹک کے گردونواح میں پہنچ کر ہی دم لیا۔

"اوہ! گیارہ بج گئے۔" میں آستین ہٹا کر گھڑی پر ٹائم دیکھتے ہوئے چونکا۔ اس وقت ہم اٹک کے ایک قصبے کے بازار سے گزر رہے تھے۔ رات کا وقت تھا۔ سردیوں کی رات تھی۔ اس لیے بازار میں ہر طرف ہو کا عالم تھا۔

اردگرد کی عمارتوں کے سائن بورڈ دور کہیں جھلملاتے دکھائی دینے لگے تھے۔ میں ڈرائیونگ کرتا ہوا بغور انہیں پڑھ رہا تھا۔ مجھے رات ٹھہرنے کے لیے کسی ہوٹل یا سرائے کی تلاش تھی۔ ایک جگہ میں نے گاڑی روک دی اور باہر نکل کر بازار میں کھلی اکا دکا دکانوں کے مالکان سے معلومات لینے لگا۔

"ادھر کوئی بڑا ہوٹل تو نہیں ہے جی۔ البتہ کاکا جی کی ایک سرائے ہے جہاں مسافر لوگوں کے رات ٹھہرانے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ وہ ادھر دائیں ہاتھ کو ڈسپنسری کے ساتھ والی عمارت ہے۔" ایک الیکٹریشن نے جامع تفصیلات فراہم کیں۔ میں نے خان زادی شمیل کو بتا کر اس کی سمت کا دروازہ کھولنا چاہا مگر اس نے اترنے سے انکار کر دیا۔

"پتا نہیں سرائے کا مالک کیسا آدمی ہو؟ مجھے یہ جگہ بہت عجیب اور پراسرار سی لگ رہی ہے۔ رات قیام کے بجائے سفر جاری بھی تو رکھا جا سکتا ہے۔"

اس کے لہجے میں جھلاہٹ' اندیشے اور بے اعتباری تھی۔

"بالفرض ہم پل کراس کر کے نکل بھی گئے تو بھی جی ٹی روڈ سے راولپنڈی تک کا سفر خاصا لمبا اور تھکا دینے والا ہوگا۔ رات آرام ضروری ہے۔ ورنہ اگلے دن فریش نہیں رہ سکیں گے۔ یہ کون سا ایک یا دو دن کا سفر ہے جو آج کل میں ختم ہو جائے گا۔" میں نے رسانیت سے سمجھایا۔

"ہم کسی فرسٹ کلاس ہوٹل میں بھی کمرے لے سکتے ہیں۔" اس کی نازک مزاجی پر بے ساختہ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تیر گئی تھی۔

"یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے بی بی۔ یہاں ہوٹل کی عیاشی ممکن ہی نہیں ہے۔ قیام کرنے کے لیے سرائے مل گئی مجھے غنیمت ٹھہری۔"

کچھ پس و پیش کے بعد وہ میرے ہمراہ نیچے اتر آئی۔

سرائے میں کھانے پینے کا انتظام ہوٹل کی طرح تھا۔ یعنی باقاعدہ لکڑی کی میز کرسیاں لگی ہوئی تھیں اور ایک "چھوٹا" میزوں پر سرو کرنے پر مامور تھا۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو اک ایسی عجیب سی مہک نے استقبال کیا جو بوسیدہ اور خستہ حال عمارتوں کا شناختی سمبل ہوتی ہے۔

اس وقت تقریباً" ساری ہی میزیں خالی تھیں۔ بس ایک میز پر دو مسافر بیٹھے چنے کی دال اور تنوری روٹی کا ڈنر کر رہے تھے۔

ہمیں بھی یہی لوازمات پیش کیے گئے۔

کھانے کے بعد میں نے کاؤنٹر پر موٹی توند اور گنجے سر والے کاکا جی سے دو کمروں کی بکنگ کے لیے بات شروع کی۔

"بابو جی۔ اتفاق سے اس وقت صرف ایک ہی کمرہ

KitabPK.Com

خالی ہے۔"

"اوہ۔" اس اطلاع نے میرے طوطے اڑا دیئے۔ وہ میرا شناختی کارڈ، وزیٹنگ کارڈ چیک کر رہا تھا۔ ساتھ ہی شاید میں نے غلطی سے نکاح نامے والا پرچہ بھی اسے تھما دیا تھا۔

"کیا یہ بی بی آپ کی بیگم ہیں؟۔"

"آں۔ ہاں۔" میں نے گڑبڑاتے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"بس تو پھر جی دوسرے کمرے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ پہلے حیران ہوا پھر دانت نکالنے لگا۔ "کہیں آپس میں کھٹ پٹ تو نہیں ہوگئی۔ جو الگ الگ کمرے میں سونا چاہتے ہیں۔"

"نن۔ نہیں۔ بھئی۔ وہ۔" میں نے کبھی زندگی میں خود کو اتنا ہونق محسوس نہیں کیا ہوگا جتنا اس وقت لگ رہا تھا۔ کوئی بات نہیں بن پڑی۔

"کیا یہاں قریب میں کوئی اور ہوٹل یا سرائے نہیں ہے؟۔" میں پریشانی سے ہاتھ ملتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"نہیں جی۔ میلوں تک کوئی اور سرائے نہیں ملے گی۔ مگر بابو جی! یہاں آپ کو کیا مسئلہ ہے۔ میرے پاس کمرہ تو ہے۔"

"اچھا۔ اچھا پھر ٹھیک ہے۔" دستور کے مطابق نصف ادائیگی کرنے کے بعد چھوٹے کی معیت میں سیڑھیاں طے کرنے کے بعد میں خان زادی کو لے کر اوپر کمرے میں آگیا۔

"یہاں بہت گھٹن ہے۔" کمرے میں بان کی دو چارپائیاں، لکڑی کی میز، دو کرسیاں اور درمیان میں چھوٹی سی بوسیدہ دری بچھی تھی۔ کوئی آرائشی سامان نہیں تھا۔ مجھے تو بہرحال غنیمت لگا مگر خان زادی کی نفیس طبیعت پر یہ بند بند سا ملگجا ماحول بہت گراں گزر رہا تھا۔

"معذرت چاہتا ہوں بی بی! مگر یہ مجبوری ہے۔" میں پشت پر ہاتھ باندھ کر کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

"آپ کس چارپائی پر سونا پسند کریں گی؟"

"کیا؟۔" اس کی آنکھوں میں پہلے حیرت اور پھر خوف و ہراس نے جگہ لے لی۔ "کیا آپ بھی ادھر ہی اس کمرے میں سوئیں گے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

اس کے لہجے کی لرزش میں میرے لیے شک اور بد اعتمادی کا تاثر جھلک رہا تھا۔ میں نے مختصراً" کاکا جی سے حاصل کردہ معلومات اس کے گوش گزار کردیں۔

"مگر۔ اس طرح۔" وہ جھجک گئی۔

"آپ تسلی رکھیں بی بی۔ آپ ایک مصیبت زدہ خاتون ہیں۔ میری سپرداری میں دی گئی ہیں۔ اگر آپ کے دل میں میرے متعلق کوئی غلط فہمی ہے تو براہ کرم اسے دور کرلیں اور بے فکری و سکون سے رات بسر کریں۔"

وہ کچھ جھجکتے ہوئے تکلف سے ایک چارپائی پر بیٹھ گئی۔ میں نے اس کے ساتھ رکھی دوسری چارپائی اٹھائی اور عین دروازے کے قریب جا کر بچھا دی۔ اب درمیانی فاصلہ خاصا زیادہ ہو گیا تھا۔

خان زادی شمیل میری موجودگی کی وجہ سے بستر پر دراز ہونے سے ہچکچا رہی تھی۔ میں نے اس کا حجاب بھانپ لیا۔

لیمپ یونہی روشن چھوڑ کر میں نے اپنی چارپائی پر لیٹتے ہوئے چادر سر تک تان لی اور کچھ دیر بعد میں بے خبر سو رہا تھا۔

♥ ♥ ♥

صبح چھ بجے میری آنکھ کھلی تھی۔ آنکھیں ملتے ہوئے میں نے اٹھ کر کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ باہر ہلکا ہلکا اجالا پھیل رہا تھا۔ میں نے مڑ کر میز پر رکھا لیمپ بجھاتے ہوئے سرسری سی نظر محو خواب خان زادی پر ڈالی۔

غالباً" تھکاوٹ کے باعث اسے گہری نیند آئی تھی۔ اس نے سیاہ اونی شال تہہ کر کے سرہانے رکھی ہوئی تھی۔ کمبل بے ترتیب سا ہو کر آدھے سے زیادہ فرش پر جھول رہا تھا۔ اس کی سیاہ ریشم سی گھنی زلفیں چہرے اور شانوں پر پریشان تھیں، ایک ہاتھ گال کے نیچے تھا اور دوسرا چارپائی کی پٹی پر جما ہوا تھا۔

میں نے بے اختیار نظر موڑ لی۔ بہرحال انسان

KitabPK.Com

تھا۔ فرشتہ نہیں تھا کہ ایسے دلکش اور ہوش اڑا دینے والے حسن کو دیکھ کر ایمان متزلزل نہ ہوتا۔

میں آواز پیدا کیے بغیر چارپائی اٹھا کر پہلے والی جگہ پر بچھانے کے بعد نیچے آگیا۔

"چھوٹے! ناشتہ مل جائے گا؟" وہ میزوں پر کپڑا پھیر رہا تھا۔

"صاب جی! سات بجے تک بنے گا۔ روٹی، مکھن، کباب اور دودھ چائے۔ اتنی جلدی تو بس چائے ہی تیار ہو سکتی ہے۔ ابھی تو ٹھیک طرح صبح بھی نہیں ہوئی۔"

"سات بجے تک ہم نہیں رکیں گے۔ تم ایسا کرو، کسی دکان سے بسکٹ کا ایک ڈبہ لے آؤ اور ساتھ چائے۔ فٹافٹ کرو۔ بلکہ اوپر کمرے میں پہنچا دینا۔"

میں آرڈر دے کر اوپر آیا۔ تو وہ اٹھ کر شال اوڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر بے اختیار میری طرف پشت کر لی تھی۔ رخ پھیرنے سے اس کی کمر پر پھیلے گھٹنوں کو چھوتے بے پناہ لمبے اور گھنے بال پشت پر چھا گئے تھے۔

"وہ۔ آپ تیار ہو جائیں۔ ہمیں چائے پی کر یہاں سے نکلنا ہے۔" میں خفیف سا ہو کر سر کھجانے لگا۔

کچھ دیر بعد ہم اٹک پہنچ گئے۔ یہاں مغلوں کا بنایا ہوا وہ قلعہ جس کا ایک سرا پہاڑ پر اور دوسرا دریائے سندھ کی لہروں کو چوم رہا تھا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے تھا۔ جی تو چاہتا تھا۔ یہیں رک کر ان تاریخی مقامات کا جائزہ لوں مگر ٹائم بہت کم تھا۔

اٹک کے تاریخی پل سے کچھ فاصلے پر میں نے اچانک بریک لگا دیے۔

"ہمارے پاس ایک ریوالور اور نقدی کی صورت میں ایک خطیر رقم بیگ میں موجود ہے۔ اسے کسی جگہ چھپانا ہوگا۔ میرا خیال ہے پچھلی سیٹ کے نیچے رکھ دیتے ہیں۔"

"مگر کیوں؟" وہ اپنے پاس رکھے اس بیگ کو اٹھا کر تجسس سے الٹ پلٹ کرنے لگی۔

"وہ سامنے دیکھیے۔" میں نے پل پر کھڑے کچھ باوردی اشخاص کی طرف اشارہ کیا جو گاڑیوں کی تلاشی لے رہے تھے۔

"یہ کسٹم کی چیکنگ پوسٹ ہے۔ لنڈی کوتل اور باڑہ میں غیر ملکی مال کی منڈیوں سے اشیاء خرید کر سرحد اور پنجاب کے اندرونی اضلاع میں منتقل کی جاتی ہیں۔ اس اسمگلنگ کی روک تھام کے لیے یہ چیک پوسٹ قائم کی گئی ہے۔ پل سے گزرنے والی ہر گاڑی کی تلاشی لی جاتی ہے۔" میرا مسئلہ اس بیگ کو چھپانا تھا۔

"کیا جامہ تلاشی بھی لی جاتی ہے۔" وہ کچھ سوچ کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے۔ پھر فکر کی کوئی بات نہیں۔" اس نے چھوٹے سے اس بیگ کو اپنی گود میں رکھ کر اوپر سے اچھی طرح سیاہ اونی شال پھیلا کر اوڑھ لی۔

جونہی گاڑی بیریر پر رکی کسٹم کے دو مستعد جوان ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آگئے۔

"اپنے کاغذات دکھائیے پلیز۔" میں نے خاموشی سے پکڑا دیے۔

"آپ لوگ کون ہیں اور کہاں سے آ رہے ہیں؟"

"ہم دونوں میاں بیوی ہیں اور سوات کی وادی سے ہنی مون ٹرپ سے واپس آ رہے ہیں۔" میں نے اعتماد سے کہا۔

کسٹم کے جوانوں نے سرسری سے انداز میں جیپ کا جائزہ لینے کے بعد اوکے کر دیا۔

میں نے کلمۂ شکر پڑھتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"آپ کو برا تو لگا ہوگا۔ مگر مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔" کچھ دور جا کر مطمئن ہونے کے بعد میں نے ایک لمحے کو آئینے میں پیچھے دیکھتے ہوئے خجالت سے اسے مخاطب کیا تھا۔ اس کے گورے دودھیا چہرے پر تمتماہٹ سی پھیل گئی تھی۔ ان دو دنوں کی رفاقت میں میں نے جانچا تھا کہ بظاہر وہ کتنی ہی سرد مہر اور مغرور سہی مگر طبعاً" شرمیلی اور باحیا لڑکی تھی۔ اس میں وہ مخصوص بے باکی مفقود تھی۔ جو شہر کی پڑھی لکھی امیر کبیر چنچل سی لڑکیوں کا خاصا ہوا کرتی ہے۔ اس کے انداز میں ایک وقار، اور سنجیدگی تھی جو اس کی پر

KitabPK.Com

تمکنت و حسین شخصیت پر بہت بھلی محسوس ہوتی تھی۔

حسن ابدال سے گزرتے ہوئے دوپہر تک ہم راولپنڈی پہنچ گئے۔ میں نے "فلیش مین" ہوٹل کے سامنے گاڑی پارک کردی۔

دو کمرے بک کروانے کے بعد ہم نے لنچ کیا اور پھر اپنے اپنے کمرے میں آرام کی غرض سے پہنچ گئے۔

†—†—†

مسلسل ڈرائیونگ نے مجھے تھکا کر چور کردیا تھا' سو دوپہر کے کھانے کے بعد جانے کتنی دیر تک اپنے کمرے میں سویا رہا۔

ایک تیز' مسلسل اور خبردار کرتی ہوئی دستک نے مجھے جگایا تھا۔ میں نے لمحے کے ہزارویں حصے میں بنا جوتے پہنے اٹھ کر دروازہ کھول دیا تھا۔

"کیا ہوا؟۔" خان زادی شمیل کا گھبرایا ہوا سراسیمہ چہرہ' پھولی سانسیں اور آنکھوں سے ٹپکتی وحشت نے ایک ثانیے میں میرے خوابیدہ حواسوں کو جھنجھوڑ کر چاق و چوبند کردیا تھا۔

وہ تیزی سے اندر آئی اور دروازہ بند کرکے اس سے پشت ٹکادی۔

"میں نے ابھی ابھی کھڑکی سے سردار کے بندوں کو گاڑی میں بیٹھے دیکھا ہے۔ گاڑی مخالف رخ جارہی تھی۔" وہ سرگوشیانہ بولی۔

"کیا؟۔" مجھ پر بجلی سی گری تھی۔ "کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ سردار شمشیر خٹک کے بندے ہی تھے؟۔"

"میں اپنے علاقے کے لوگوں کو آنکھیں بند کرکے پہچان سکتی ہوں۔" اس کے لہجے میں تیقن تھا۔

"وہ کسی بھی لمحے ہوٹل کا رخ کرسکتے ہیں اور پارکنگ میں کھڑی جیپ پہچان کر ہم تک پہنچنا بے حد آسان ہوجائے گا۔" وہ بدحواسی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میرا ذہن تیزی سے اگلے اقدام کے تانے بانے بن رہا تھا۔

میں نے وال کلاک کی سمت دیکھا۔

شام کے پانچ بجنے کو تھے۔

"راولپنڈی میں ریلوے اسٹیشن ہے۔ وہیں چلتے ہیں اور جو بھی ٹرین مل جائے ٹکٹ لے کر روانہ ہوجائیں گے۔ موجودہ صورت حال میں بائی روڈ سفر جاری رکھنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ میری تجویز سنتے ہی الرٹ ہوگئی اور اپنے کمرے سے بیگ لینے گئی میں نیچے استقبالیہ کلرک کے پاس آگیا۔ کمرے ایک رات کے لیے بک کروائے گئے تھے۔ میں نے بل پے منٹ کرنے کے بعد چابیاں جمع کرائیں اور شمیل کو ہمراہ لے کر پارکنگ لاٹ میں آگیا۔

ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کے بعد پہلے میں نے پچھلے دروازے کا لاک کھولا پھر فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا تاکہ باہر کھڑی خان زادی شمیل سے بیگ لے کر اگلی سیٹ پر رکھ سکوں۔

مگر دوسرے ہی لمحے میں حیرت زدہ رہ گیا جب خان زادی اگلی سیٹ پر میرے ساتھ بیٹھ گئی۔

میں سر جھٹک کر ڈرائیونگ کرنے لگا۔ جیپ کا رخ ریلوے اسٹیشن کی جانب تھا۔

"وہ۔ وہ۔" جونہی میں موڑ مڑنے لگا' میرے ساتھ بیٹھی خان زادی شمیل نے اچانک دونوں ہاتھوں سے میرا بایاں بازو پکڑلیا۔ اس کی گرفت میں ہیجانی کیفیت تھی۔ میں نے جلدی سے اسٹیئرنگ پر توازن قائم رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

"اس سڑک پر سردار کے بندوں کی جیپ کھڑی ہے۔ وہ دیکھیں سگنل پر۔"

اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ زبان خشک ہورہی تھی اور سرگوشیانہ لہجہ یوں ہانپ رہا تھا جیسے میلوں فاصلہ طے کرنے کے بعد یہاں پہنچی ہو۔

میں نے نرمی سے بازو اس کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ اسی لمحے جیپ میں سوار تین اسلحہ بردار بندوں کی نظر ہماری طرف اٹھی تھی۔ انہوں نے جلدی سے آگے جھک کر اگلی سیٹوں پر بیٹھے دو بندوں سے کچھ بات کی تھی۔

KitabPK.Com

"انہوں نے ہمیں پہچان لیا ہے۔ خدا کے لیے یہاں سے نکل چلیں۔" خان زادی کا لہجہ دہشت سے بھرا گیا تھا۔

اب ریلوے اسٹیشن تک پہنچنے کا ارادہ خواب بن گیا تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر اچانک رخ بدل کر ایک پتلی سی سڑک پر گاڑی ڈال دی۔

"وہ لوگ ہمارے پیچھے آرہے ہیں۔" خان زادی شمیل پیچھے دیکھتے ہوئے بے ساختہ تھرا اٹھی۔

"ریلیکس۔ اللہ نے چاہا تو ہم ان کے نرغے سے بچ نکلیں گے۔" میں اندھا دھند جیپ دوڑاتا چلا گیا۔ یہ سڑک غالباً" کسی قصبے یا دیہات کی طرف جارہی تھی۔ اطراف میں ویرانی تھی۔ عشاء کی اذانیں ہو رہی تھیں۔

تقریباً" ایک گھنٹے تک بلی چوہے کا یہ کھیل جاری رہا۔ وہ مشکوک جیپ مسلسل تعاقب میں تھی۔ جانے ہم کدھر نکل آئے تھے۔ شہر کی حدود کب کی ختم ہو چکی تھیں۔

"اس طرح بات نہیں بنے گی۔" جنگل کی حدود شروع ہوتے ہی اچانک میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح چمکا تھا۔ رات کا وقت تھا اور اطراف میں کہیں کھیت تھے، کہیں جنگل تو کہیں مٹی کے اونچے نیچے ٹیلے تھے۔ یہاں چھپ کر تعاقب کرنے والوں کو ڈاج دیا جاسکتا تھا۔

یکلخت میں نے گاڑی روک دی۔ چھوٹا بیگ اپنے قبضے میں کیا اور جلدی سے دوسری طرف سے دروازہ کھول کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"آیئے۔ جلدی کیجیے۔ اب ہمیں پیدل بھاگنا ہوگا۔"

وہ اس وقت انکار یا اقرار کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ دشمن کسی بھی لمحے سر پر پہنچنا چاہتے تھے۔ سو بلا تامل اپنا ریشم سا ملائم ہاتھ میرے لمبے چوڑے مضبوط ہاتھ میں تھما دیا۔

اگلے لمحے ہم سرپٹ دوڑ رہے تھے۔

جنگل میں ہر طرف تاریکی کا راج تھا، صرف جھینگروں کے بولنے اور مینڈکوں کے ٹرانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ہم لوگ سڑک سے کافی دور آچکے تھے۔ جب سڑک پر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ گویا وہ تعاقب کرتے ہوئے ہماری گاڑی تک پہنچ چکے تھے۔ اب وہ کسی بھی لمحے ادھر آیا ہی چاہتے تھے۔

"اب کیا ہوگا۔ وہ ہمیں با آسانی تلاش کر سکتے ہیں۔" خوف سے اس کا خون خشک ہو گیا تھا اور پورا بدن کانپ رہا تھا۔

"ہمیں کسی محفوظ جگہ چھپنا ہے تاکہ ان کی نظروں میں نہ آئیں۔" میں اس کا ہاتھ تھامے دوڑتا ہوا تیزی سے ادھر ادھر نگاہ بھی دوڑا رہا تھا۔

"شاید وہ لوگ ادھر ہی آرہے ہیں۔" اسی لمحے درختوں کے اندر سٹریچر اور قدموں کی دھمک کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ ایک لمحے کو تو میرا دماغ ماؤف ہو کر رہ گیا۔

ہم بھاگتے بھاگتے جنگل سے کچھ دور نکل آئے تھے۔ اب اطراف میں کچھ اونچے نیچے ٹیلے تھے مگر ان کی آڑ لے کر چھپنا بے کار تھا۔ فوراً" دیکھے جاسکتے تھے۔

بھاگتے بھاگتے اچانک ہم دونوں کے قدم ایک کھائی پر پڑے اور اگلے لمحے ہم دونوں اس گہری کھائی کے اندر تھے۔ خان زادی شمیل تو شاید چیخ ہی پڑتی مگر میں نے اس خدشے کے پیش نظر فوراً" ہی اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کی چیخ کا گلا گھونٹا تھا۔

میں نے کچھ سنبھلتے ہوئے اس گڑھے کا جائزہ لیا تو ایک عجیب صورت حال سامنے آئی۔ گڑھے کی لمبائی چھ فٹ اور چوڑائی چار فٹ تھی۔ اہم بات یہ تھی کہ اس کے اوپر چھت سی بنائی گئی تھی۔ جس طرح قبر پر بنائی جاتی ہے۔ اس کی اونچائی تقریباً" چار فٹ تھی اور یہ صرف ایک طرف سے کھلی تھی جہاں سے ہم پھسل کر اندر گرے تھے۔ گویا اگر وہ سوراخ بند کر دیا جاتا تو اوپر سے کچھ بھی نظر نہ آتا۔

میں چیتے کی سی تیزی سے اٹھا مگر پورا نہ اٹھ سکا کہ اونچائی صرف چار فٹ تھی تاہم کسی نہ کسی طرح رینگتا ہوا اس گڑھے کے منہ تک پہنچا۔ اور ارد گرد سے سوکھی گھاس کا چھوٹا سر ڈھیر گڑھے کے منہ کے

پاس جمع کرنے کے بعد دوبارہ گڑھے میں رینگتا ہوا اتر گیا اور اندر سے ہاتھ ڈال کر گڑھے کے منہ پر رکھے گھاس کے ڈھیر سے سوراخ کور کرنے لگا۔ یہ دھیان رکھا کہ اندر ہوا پہنچنے کا انتظام رہے۔

سوراخ کا منہ بند ہوتے ہی گڑھے کے اندر مکمل تاریکی چھا گئی۔ میں کھسکتا ہوا جونہی لیٹے لیٹے کروٹ لے کر مڑا ایک نرم و گداز پر حرارت وجود سے ٹکرا گیا۔

"یہ۔ یہ۔ اس سوراخ کو کیوں بند کر دیا۔" خان زادی شمیل کی گھبرائی، دہشت زدہ آواز میرے بہت قریب سے کانوں میں سنائی دی تھی۔

"شی۔ آہستہ۔ شاید وہ لوگ ادھر ہی آ رہے ہیں۔" میں نے سرگوشی کی۔ "فی الوقت اس سے بہتر اور بروقت پناہ گاہ اور نہیں مل سکتی۔"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ لگتا ہے کسی قبر میں زندہ دفن ہو گئے ہیں۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ زمین میں کیڑے مکوڑے بھی ہوں گے۔" وہ ایک دم بے اوسان ہو کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

جگہ اس قدر تنگ اور ناکافی تھی کہ اس کی سسکیاں، اس کے بکھرے ٹوٹے سانس ٹھنڈے ٹھنڈے آنسو اور بال سیدھا میری گردن پر مس ہو رہے تھے۔ عجیب خجالت آمیز پوزیشن تھی۔ دونوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایسی بے بسی کی گرفت میں آئیں گے۔

"وہ ادھر ہی ہوں گے۔ تلاش کرو اچھی طرح۔ مجھے یقین ہے وہ یہیں کہیں چھپے ہیں۔"

دوڑتے بھاگتے قدم سطح زمین پر ٹک گئے تھے۔ ایک تیز سی تحکمانہ آواز پورے ماحول کی خاموشی کا سینہ چیرتی ہوئی اندر تک پیوست ہوتی چلی گئی تھی۔

خان زادی شمیل کی تو جان ہی اٹک گئی۔ اس کا دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔ وہ کھسکتی ہوئی اچانک میرے نزدیک ہو گئی۔ اس کے خاموش بے بس آنسو میری قمیص بھگوتے چلے گئے تھے۔ اوپر قدموں کی دھمک دھڑکنیں منتشر کر رہی تھی۔

خان زادی کا پورا بدن بارش میں بھیگی چڑیا کی طرح کانپ رہا تھا۔ میں نے محض اسے حوصلہ دینے کے لیے آہستگی سے اس کے گرد بازو حمائل کر دیئے۔ خود میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

اگر پکڑے گئے تو مجھے تو خیر جو سزا ملے گی مگر خان زادی کا حشر عبرت ناک ہو گا۔ اسے شمشیر خٹک جیسے بھوکے درندے کے آگے چارے کے طور پر ڈال دیا جائے گا۔ اور اسے ایک ایسی زندگی گزارنی پڑے گی جس میں موت کی دعا تحفے کے طور پر مانگی جاتی ہے۔ غالباً" یہی سوچیں اس کے ہراساں ہونے کا باعث تھیں۔ موت آنکھوں کے آگے تارے بن کر ناچ رہی تھی۔ تقریباً" آدھے گھنٹے تک ہم دونوں دم سادھے ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں سنتے رہے۔ قدموں کی دھمک کبھی قریب آتی کبھی دور چلی جاتی۔

"وہ ادھر ہی ہیں۔ چاروں طرف گھیرا ڈال لو۔ ہم صبح ہونے تک ان کی تلاش جاری رکھیں گے۔" بالآخر ان کے سرغنہ نے اعلان کیا تھا۔

"اوہ۔" میرے ہونٹوں سے طویل سانس نکل گئی۔ گویا صبح تک ہمیں اسی مدفون میں رہنا تھا۔ میرے اعصاب قدرے ڈھیلے پڑنے لگے تھے کہ بہرحال ہم عارضی طور پر ان کی دستبرد سے محفوظ تھے۔ وہ دو تین بار اس جگہ سے گزرے تھے مگر کھوج نہ پا سکے تھے۔ ایک طرف کی پریشانی سے وقتی طور پر نجات ملی تو دوسری کی طرف دھیان چلا گیا۔ اب تک تو ہم دونوں نے زندگی اور موت کے درمیان فاصلہ ناپنے کی کشمکش اور خوف میں اپنی پوزیشن پر زیادہ غور نہیں کیا تھا مگر اب حسیات یکبارگی جاگ اٹھی تھیں اور اس نرم گرم قربت نے بری طرح حواس باختہ کر ڈالا تھا۔

غیر ارادی طور پر میرے بازوؤں کا حلقہ اس کے گرد سخت ہو گیا۔

"آخر کو یہ گناہ تو نہیں ہے۔" میرا نفس اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے تاویلیں ڈھونڈ رہا تھا۔ "یہ میری جائز اور شرعی منکوحہ ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں جذبات کے سمندر میں خود کو سرکش و منہ زور لہروں کے حوالے کرتا ایک دم کہیں

اندر سے بے بے جی کی بتائی ہوئی نیک باتیں ذہن سے ٹکرانے لگیں۔

"پتر! کبھی کسی سے بے ایمانی نہ کرنا۔ کسی کو دھوکا نہ دینا۔ اور کسی کی امانت پر بری نظر نہ رکھنا۔ جو وعدہ کرو اسے نبھانا۔ ہمارے نبی جی فرماتے ہیں جس کا عہد نہیں اس کا کوئی دین نہیں۔" میرے اندر جیسے دھماکے سے ہوتے چلے گئے۔ میں ایک دم ٹھٹک کر ہوش و حواس کی دنیا میں واپس لوٹ آیا۔ خود بخود میری گرفت ڈھیلی پڑتی گئی۔

♥ ♡ ♡ ♥

"داؤد گل۔ سارے بندے واپس بلالو۔ وہ لوگ یہاں سے نکل چکے ہیں۔ ہوتے تو اب تک مل چکے ہوتے۔ تین گھنٹوں سے ہم لوگ خوار ہو رہے ہیں۔ حیات خان تم چل کر جیپ اسٹارٹ کرو۔ جہلم کی طرف چلتے ہیں ہو سکتا ہے اس شہر کے آس پاس مل جائیں۔"

ایک طویل اعصاب شکن انتظار کے بعد وہ حیات آفریں زندگی دینے والی آواز کان میں پڑی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جیپ اسٹارٹ ہو گئی۔

"وہ۔ وہ نکل گئے ہیں۔" خان زادی شمیل نے کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بے تابی سے کہا۔

"شی۔ کم از کم دس منٹ ہمیں مزید انتظار کرنا چاہیے۔ کہیں وہ پلٹ کر نہ دیکھ لیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی چال چلنے کے موڈ میں ہوں۔"

بہرحال دس منٹ کے جان لیوا انتظار کے بعد میں احتیاطاً پہلے خود باہر نکلا۔ ادھر ادھر دیکھا، پھر تسلی کر لینے کے بعد گڑھے کے اندر ہاتھ بڑھا کر خان زادی شمیل کو باہر نکلنے میں مدد دی۔

"آہ ــــ!" یوں لگا جیسے صدیوں بعد کھلی تازہ ٹھنڈی ہوا میں سانس لیا ہو۔ میں بے اختیار لمبے لمبے سانس لے کر پھیپھڑوں میں فریش ہوا بھرنے لگا۔ اتنی دیر تک ساکت و صامت ایک ہی پوزیشن میں دبکے رہنے سے ہاتھ پیروں میں اینٹھن سی ہو گئی تھی۔ میں ادھر ادھر نظریں دوڑا کر سڑک کے آثار ڈھونڈ رہا تھا جہاں ہم نے اپنی جیپ پارک کی تھی۔ صبح کاذب کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ ابھی صبح کی اذانیں ہونے میں کچھ وقت باقی تھا۔ اردگرد رات کا خواب آلود گم صم سناٹا اور اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ میں خان زادی شمیل کا ہاتھ پکڑ کر اندازے سے ایک طرف چل پڑا۔

"وہ رہی گاڑی۔" پندرہ منٹ مسلسل چلتے رہنے کے بعد بالآخر ہم جیپ تک پہنچ چکے تھے۔

"اب ہم کہاں جائیں گے" خان زادی شمیل نے رکی جھجکی آواز میں نظریں جھکا کر پریشانی سے دریافت کیا۔

میں تیزی سے آئندہ کے لیے لائحہ عمل بنا رہا تھا۔

"میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے کیوں نہ ہم موٹر وے کے ذریعے لاہور چلے جائیں۔ غالباً" ساڑھے تین گھنٹوں میں پہنچ جائیں گے۔"

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے اس کی رائے لی ہم دونوں جیپ پر سوار ہو چکے تھے اور حیرت انگیز طور پر خان زادی شمیل پیچھے بیٹھنے کے بجائے میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔

اس کے بے تحاشا لمبے ریشمی گھنٹوں کو چھوتے بال گرد آلود ہو چکے تھے اور بے ترتیبی سے شانوں، کمر اور گردن سے لپٹے ہوئے تھے۔ اس کے بائیں گال پر مٹی کے نشان نظر آ رہے تھے۔ دونوں ہاتھ اور پاؤں بھی مٹی مٹی ہو رہے تھے۔ یہی حال کپڑوں کا تھا۔ خود میری حالت بھی مختلف نہ تھی کپڑوں کا بیگ غالباً" افراتفری میں خان زادی رکھنا بھول گئی تھی۔ مجھے خود بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ دو جوڑے کپڑے رکھ لیتا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ رات کے پچھلے پہر ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان یا بوتیک کے کھلے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ایسے میں کیا کیا جائے۔

"کسی ہوٹل کا رخ کریں، کم از کم نہا دھو کر صاف تو ہو جائیں گے صبح دکانیں کھلنے کے بعد آپ جا کر کپڑے لے آئیے گا اس کے بعد لاہور کی طرف

نکلیں گے۔" خان زادی شمیل کی تجویز بے حد مناسب تھی۔ سو میں نے یہی کیا، ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں ایک کمرہ مل گیا۔ اسی کو غنیمت جانا خان زادی آتے ہی باتھ روم میں گھس گئی تھی۔ اس جیسی نازک طبع لڑکی کے لیے یہ اتنی گندگی اور گرد و غبار برداشت کرنا بڑا صبر آزما تھا۔

تقریباً دس بجے ناشتے سے فارغ ہوتے ہی میں قریبی مارکیٹ چلا گیا۔ واپس آیا تو میرے ہاتھ میں ایک بڑا سا لفافہ تھا اس میں دو میرے اور دو خان زادی شمیل کے سوٹ تھے۔

"معاف کیجئے گا، مجھے زنانہ شاپنگ کا قطعی کوئی تجربہ نہیں ہے ہو سکتا ہے آپ کو کپڑے کی کوالٹی رنگ یا سلائی پسند نہ آئے، اپنی طرف سے تو میں نے آپ کے ذوق کا خیال رکھتے ہوئے خریداری کی ہے لیکن۔۔۔"

"اتنے تکلفات میں کیوں پڑتے ہیں مظہر صاحب! اس وقت تو جو بھی مل جائے غنیمت ہے۔" اس کے انداز میں اپنائیت اور نرمی تھی۔

لفافہ کھول کر کپڑے پھیلا کر دیکھ رہی تھی۔ ایک سرخ رنگ کا کاٹن کا جدید تراش خراش کا ہلکا پھلکا سوٹ تھا اور دوسرا سیاہ فراک، سفید پاجامہ اور سفید بڑے سے سیاہ پٹی لگے سوتی دوپٹے پر مشتمل تھا۔ کپڑے دیکھ کر خان زادی شمیل کے چہرے پر چمک آ گئی۔

"یہ دونوں کلرز میرے پسندیدہ ہیں۔" اس کی آنکھوں میں سچ مچ ستائش تھی یا صرف مجھے ہی لگی۔

"چلیے۔" اس کی آواز سنتے ہی بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور مڑ کر دیکھا۔ ایک لمحے کو میں ششدر سا رہ گیا۔

سرخ کاٹن کے شلوار قمیض میں سرخ بڑا سا دوپٹہ سلیقے سے اوڑھے بالوں کی سیاہ گھنی بے حد چمکیلی چٹیا پشت پر ڈالے وہ اپنے یاقوتی مرطوب لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ لیے کھڑی تھی۔ اس کی بھوری خوابناک آنکھوں میں قدرتی گلابی ڈورے تیر رہے تھے۔ اس کی دودھیا چاندنی کی رنگت سرخ لباس میں ایک دم دہک کر شعلہ فشاں ہو گئی تھی۔

مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ جس لڑکی کو گزشتہ چار دن سے اپنے ہمراہ لیے پھر رہا ہوں وہ اس درجہ حشر ساماں اور قیامت خیز حسن و شباب کی مالک ہے۔

آج غیر ارادی و بے ساختہ اٹھنے والی نگاہ نے اس کا سراپا جائزہ لیا تھا۔ میری تفصیلی نظر کے جمود سے خان زادی شمیل پریشان و محجوب ہو گئی اور قدرے ترچھی ہو کر رخ پھیر لیا۔

"آیئے۔" میں ایکدم ہوش میں آ کر خود کو تازہ ہوا سر جھٹک کر باہر نکل گیا۔ وہ حسب معمول اگلی سیٹ پر میرے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کے اس انداز سے اس کے مجھ پر اعتبار اور اعتماد کا اظہار ہوتا تھا۔

"کیا اب اس جیپ پر سفر کرنا خطرناک نہیں ہو گا۔" جوں ہی ہم موٹروے کی کشادہ چھ رویہ سڑک پر عازم سفر ہوئے اچانک اسے خیال آ گیا۔

"کم از کم ایک آدھ دن تک ایسا امکان نہیں ہے، ان لوگوں نے خود دیکھا تھا کہ جیپ کھڑی تھی اور ہم وہاں سے غائب تھے، وہ یہی سمجھے ہوں گے کہ اب ہم جیپ چھوڑ کر کسی اور ذریعے سے سفر کریں گے۔"

میرا جواب سن کر وہ مطمئن ہو کر سر ہلانے لگی۔

"دیکھیے کتنی حسین جگہ ہے اگر وقت ہوتا تو میں یہاں ٹھہرنا ضرور پسند کرتی۔"

کلر کہار کے سرسبز و پر فضا مقام سے گزرتے ہوئے اس نے بے ساختہ مجھے متوجہ کیا تھا، اس کے انداز تخاطب میں دوستانہ سی بے تکلفی نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے ایک نظر اس کی سمت دیکھا۔

وہ بہت دلچسپی سے میرے ہمراہ بیٹھی ارد گرد کے نظارے دیکھ رہی تھی۔

"میں لاہور کے تاریخی مقامات دیکھوں گی۔ زندگی میں پہلی بار پنجاب کے میدانی علاقوں کا سفر کر رہی ہوں۔ اس سے پہلے یہ میرے لیے ڈریم لینڈ ہی تھے۔"

لاہور پہنچ کر ہوٹل سے کھانا کھا کر اٹھے تو خان زادی شمیل نے فرمائش کی۔ وہ پہاڑی علاقوں کی پروردہ تھی۔ پشاور میں تعلیم کی غرض سے قیام تھا۔ بس اس کے علاوہ دیگر علاقوں کے بارے میں بس سن رکھا تھا۔ اس لیے اس کی دلچسپی فطری تھی۔ میں نے

رضامندی کے اظہار کے طور پر کندھے اچکا دیے۔ کوئی اور کام بھی تو نہیں تھا۔ یوں بھی ہمیں کون سا کسی جگہ پہنچنا تھا۔ بس بھٹکنا ہی تو تھا۔ سو تھوڑی سیر کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

میں نے ہوٹل کے بجائے ماڈل ٹاؤن میں واقع ایک پرائیویٹ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرنے کو ترجیح دی تھی تاکہ نظروں میں نہ آسکیں۔

اس دن یہاں ہمارا دسواں دن تھا۔ جب ویٹر شام کی چائے کمرے میں پہنچانے کے لیے آیا۔

میں اس وقت شام کا اخبار پڑھ رہا تھا۔ ہم نے دو کمرے لیے تھے۔ دونوں سارا دن اپنے اپنے کمرے میں پڑے رہتے تھے۔ اسے کہیں تفریحاً جانا ہوتا تو بتا دیتی تھی۔

"صاحب جی! پولیس کے کچھ بندے آئے ہیں۔ یہاں کا معائنہ کرنے۔ انہیں ایک جاسوسی ایجنٹ اور اس کی ساتھی عورت کی تلاش ہے۔ مختلف جگہوں پر چھاپے مار رہے ہیں۔ ان کو اطلاع ملی ہے کہ دونوں غیر ملکی ایجنٹ کسی گیسٹ ہاؤس میں روپوش ہیں اور ان کے پاس ایک جیپ بھی ہے۔"

ویٹر نے بڑی رازداری سے بتاتے ہوئے معنی خیز نظر مجھ پر ڈالی تھی۔

"کیا؟۔" میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ میں ایک دم اچھل کر بیڈ سے اٹھ گیا۔

"ہاں جی۔ پولیس ہر کمرے کی تلاشی لے رہی ہے اور پوچھ گچھ کر رہی ہے۔"

ویٹر تو بتا کر بلکہ بم دھماکا کر کے چلا گیا۔ مگر میرے ہاتھوں کے طوطے اڑا گئے۔ مجھے شمیل کی فکر تھی۔

اس سے پہلے کہ باہر نکلتا دروازہ ایک تیز دستک کے ساتھ ہی کھلتا چلا گیا۔

پہلے گھبرائی بوکھلائی شمیل اندر داخل ہوئی اور اس کے پیچھے ایک چھریرے بدن اور لمبے قد کا پروقار سا پولیس آفیسر وردی میں نظر آیا۔ اس کے پیچھے اس کا اسٹنٹ اٹین سیشن کھڑا تھا۔ خان زادی شمیل لپک کر میرے قریب چلی آئی تھی۔

"مسٹر مظہر حسین۔ یہی نام ہے ناں آپ کا۔" وہ آفیسر تیز نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"ان محترمہ کا بیان ہے کہ آپ ان کے شوہر ہیں۔ کیا میں آپ کے کاغذات دیکھ سکتا ہوں۔"

"جی۔ کیوں نہیں۔ آپ اطمینان سے اپنی تسلی کیجئے۔" میں نے بروقت خود کو سنبھال کر پراعتماد انداز میں جواب دیا۔ پھر اپنا شناختی کارڈ نکال کر دکھایا۔

"آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں؟۔" وہ بغور کاغذات دیکھ رہا تھا۔

"وادیٔ سوات کے ایک گاؤں اڈیگرام سے۔ میں وہاں حیات ہاسپٹل میں ڈاکٹر کے فرائض انجام دیتا ہوں۔ میری مسز خان زادی شمیل بھی ڈاکٹر ہیں۔ ابھی پندرہ روز قبل ہماری شادی ہوئی ہے۔ آپ چاہیں تو تصدیق کر سکتے ہیں۔"

"اتنے دور دراز پہاڑی علاقے سے یہاں لاہور کس مقصد کے لیے آئے ہیں؟۔" اب وہ نکاح نامہ چیک کر رہا تھا۔

"ہنی مون منانے کے لیے۔" میں نے بلا جھجک رٹا رٹایا جواب دیا۔

"اصل میں خان زادی کے لیے میدانی علاقوں کی سیر و تفریح میں زیادہ دلچسپی اور کشش تھی۔"

"اوکے!" آفیسر پراسرار انداز میں مسکرایا۔ "اب آپ صرف ایک اور سوال کا جواب دے دیں پھر ہم مطمئن ہو جائیں گے۔ جیسا کہ اس نکاح نامے سے ثابت ہو گیا ہے کہ آپ دونوں میاں بیوی ہیں۔ اور آپ کے ہاسپٹل کے کارڈ سے یہ تصدیق ہو گئی ہے کہ آپ ایک ڈاکٹر ہیں اور لاہور ہنی مون ٹرپ پر آئے ہیں۔ کیا یہ ناقابل یقین سی بات نہیں ہے کہ محض دو ہفتوں میں آپ ایک دوسرے سے اس حد تک بیزار ہو گئے ہیں کہ اتنے مہنگے گیسٹ ہاؤس میں دو کمرے کرائے پر لے کر رہ رہے ہیں؟۔"

"دیکھیے آفیسر! ہم دونوں ڈاکٹر ہیں اور احتیاط کے تمام تقاضوں سے بخوبی واقف ہیں۔ میری بیگم کی ابھی پچھلے ہفتے پریگننسی کنفرم ہوئی ہے۔ گائنا کولوجسٹ نے ان کا کیس پیچیدہ قرار دیتے ہوئے سختی سے ہدایات کی ہیں۔ اس کے پیش نظر یہ احتیاط

ملحوظ خاطر رکھی گئی۔"

خدا جانے کس جرات و جسارت سے میں نے بے دھڑک جواز داغا تھا۔

آفیسر کچھ جھینپ کر مسکرا دیا۔ "اوکے۔ ٹیک یور ٹائم۔ ہم چلتے ہیں۔ تکلیف دینے پر معذرت خواہ ہیں۔" وہ اپنے اسسٹنٹ سمیت باہر نکل گیا اور اسی کے پیچھے خجالت و شرمندگی سے سرخ ہوتی ہوئی شمیل لپکی تھی۔ میں اپنی جگہ خجالت اور کھسیاہٹ کا شکار تھا۔

میں بے وقوفوں کی طرح سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا بیڈ پر ڈھیر ہو گیا۔

♥_♥_♥

بہر حال اگلے دن میں کوچ کرنے کا سوچ چکا تھا۔ ناشتا کرنے کے بعد میں کاؤنٹر پر خان زادی کے لیے پیغام چھوڑ کر ریلوے اسٹیشن چلا گیا۔ سہولت کے پیش نظر ایک کوپا بک کروالیا۔

واپس آیا تو اس کے کمرے میں دستک دے کر اندر چلا آیا۔

وہ بستر پر نیم دراز کندھوں تک کمبل لپیٹے کچھ پڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"آیئے پلیز۔" اس کا انداز، شائستہ اور اپنائیت آمیز تھا۔

"کل ہم کراچی جا رہے ہیں، بائے ٹرین۔" میں ایک کرسی سنبھال کر اسے مطلع کرنے لگا۔ میرا جسم صبح سے بری طرح دکھ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بخار کا حملہ ہونے والا ہو۔ بدن میں اینٹھن سی ہو رہی تھی۔ شاید موسم کا اثر تھا۔

"اوہ۔ اچھا۔"

"آپ صبح تیار رہیے گا خان زادی!"

"ایک منٹ، میرا نام خان زادی نہیں شمیل ہے۔ آپ مجھے اس نام سے پکار سکتے ہیں۔"

اس نے جس طرح میری بات کاٹ کر مجھے ٹوکا، یہ مجھے حیران کر دینے کے لیے کافی تھا۔ تاہم میں نے دانستہ بات کو آگے نہیں بڑھایا۔

"چلیے شمیل بی بی! ایسے ہی سہی۔ آپ پلیز صبح تیار رہیے گا۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹھیں گے نہیں۔" وہ ایک نظر مجھ پر ڈال کر بولی۔

"نہیں۔ خوا مخواہ آپ ڈسٹرب ہوں گی۔ میں تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

میں باہر آ گیا۔

اگلی صبح روانگی کے اوقات میں مجھ پر کسلمندی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے ویٹر سے ڈسپرین منگوا کر کھالی تھی مگر سر درد میں کوئی افاقہ نہیں ہوا۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" پلیٹ فارم پر گاڑی کے انتظار میں کھڑی شمیل نے تشویش سے پوچھا تھا۔

"جی۔ اللہ کا شکر ہے۔" میں نے اخلاقاً مسکرا کر تسلی کرائی۔

البتہ کوپے میں سامان رکھنے کے بعد مجھ میں ہمت نہیں رہی۔ کسی نہ کسی طرح سیٹ تک پہنچا اور بری طرح ڈھیر ہو گیا۔

شمیل پریشان سی ہو کر میرے قریب چلی آئی۔

"آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے۔" اس نے میری نبض چیک کی۔

"آپ کو تو ٹمپریچر ہے اچھا خاصا۔"

"بس ایسے ہی معمولی سا ہے۔ میں نے پین کلر لے لی تھی۔ ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں اس کے اس طرح اپنائیت سے ہاتھ پکڑنے پر گڑبڑا سا گیا تھا۔ میں نے ٹالنے والے انداز میں کہتے ہوئے اس کی اپنائیت کے اس مظاہرے سے بچنے کی کوشش کی تھی مگر وہ ایک ڈاکٹر تھی۔ اور اندازہ لگا چکی تھی کہ کم از کم ۱۰۲ بخار تھا۔ وہ سیٹ پر میرے پاس بیٹھ گئی اور میرا سر دبانے لگی۔

"پلیز۔ شمیل بی بی۔ یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔" میں بری طرح گھبرا کر اس کے ہاتھ ہٹانے لگا۔ "کیوں شرمندہ کرتی ہیں مجھے۔ آپ کا منصب اس کی اجازت نہیں دیتا۔ پلیز۔ آپ دوسری سیٹ پر تشریف رکھیے۔" اس کے ریشمی ہاتھوں کے لمس اور اس کے وجود سے پھوٹنے والی قدرتی سحر انگیز مہک نے

میرے چھکے چھڑا دیئے تھے۔

"آپ اتنا تکلف کیوں برتتے ہیں مظہر! ہم اس وقت ایک جیسے حالات کا شکار ہیں اور ہماری منزل ایک ہے۔ آپ پچھلے دو ہفتوں سے میری خاطر تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ جواب میں میں نے تھوڑا سا تعاون کر دیا تو کیا ہوا۔"

اس کا شیریں لہجہ بہت سلجھا ہوا اور مہربان تھا۔ مسٹر مظہر یا مظہر صاحب کے بجائے صرف مظہر کہہ کر مخاطب کرنا بذات خود ایک دوستانہ اور اپنائیت آمیز تعلق کا اظہار تھا۔ وہ بدستور میرے پاس بیٹھ کر میرا سر دباتی رہی۔ میں متذبذب سا بے چین سا منع کرتا رہ گیا۔ یہ الگ بات تھی کہ دکھتی ہوئی کنپٹیاں، جلتا ہوا ماتھا اور سلگتے اعصاب اس کی عنایت کے سبب بتدریج سکون پا رہے تھے۔ میں نے دھیرے سے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی ملائم انگلیاں میرے بالوں کی جڑوں کو سہلاتی ہوئی دھیرے دھیرے مجھ پر ایک سرور آگیں کیفیت طاری کرتی گئی تھیں۔ مجھے خبر بھی نہ ہوئی، جانے کب میں نیند کی وادیوں میں اترتا چلا گیا اور جب ہوش آیا تو یہ دیکھ کر میرے پورے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں کہ میرا سر اس کے زانو پر ٹکا ہوا تھا۔ وہ جاگ رہی تھی اور مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر ہلکی سی متبسم ہوئی تھی۔ میں بری طرح گھبرا گیا، خود پر نفرین بھیجنے لگا۔

"اوہ۔ مم۔ میں۔ بے حد معذرت خواہ ہوں شمیل۔ شاید نیند کے جھونکے میں مجھ سے یہ گستاخی سرزد ہو گئی۔" عجب بوکھلاہٹ اور شرمندگی کے عالم میں، میں کرنٹ کھا کر اٹھا تھا اور سٹپٹائے ہوئے انداز میں صفائیاں دے رہا تھا۔

"آپ کا بخار خاصا کم ہو گیا ہے۔ کہیے سر درد میں کچھ افاقہ ہوا؟"

وہ میری معذرت نظر انداز کرتے ہوئے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ کر پوچھنے لگی۔ بھلا ایسے گداز ریشم سے ہاتھوں کے لمس کی مسیحائی کے بعد درد باقی رہ سکتا تھا؟

"میں بالکل ٹھیک ہوں اور خود کو چاق و چوبند محسوس کر رہا ہوں۔ آپ نے کھانا تو نہیں کھایا ہو گا۔ رات کے نو بج رہے ہیں۔ ٹھہریے میں ڈائننگ کار سے منگواتا ہوں۔"

میں اس وقت خود کو بالکل ہونق محسوس کر رہا تھا۔ کھانے کے بعد میں نے شمیل کو اوپر کی برتھ پر چڑھنے میں مدد دی۔ نچلی سیٹ پر میں خود دراز ہو گیا۔

*_*_*

تقریباً" دس بارہ دن کراچی میں مارے مارے پھرنے کے بعد میں نے اپنے سفر کی آخری منزل یعنی اپنے گاؤں کرم پور کا رخ کیا کہ خان حیات ابراہیم کے بندوں نے وہیں مجھ سے رابطہ کرنا تھا۔ اب ہمیں اڈیگرام سے نکلے ایک ماہ ہونے کو آیا تھا۔ یقیناً" اب تک شمشیر خٹک سے تصفیہ ہو چکا ہو گا۔ کرم پور ضلع وہاڑی کی تحصیل میلسی کا ایک سرسبز و شاداب سا گاؤں تھا۔ زیادہ تر آبادی کا پیشہ کھیتی باڑی تھا۔ شہر سے تانگے کے ذریعے گاؤں کے لیے روانہ ہوئے۔ جونہی گاؤں کے آثار نمودار ہوئے راہ میں میرے جاننے والے دکھائی دینے لگے۔ کوئی فصلوں میں اسپرے کر رہا تھا، کوئی کھیت میں ہل چلاتا ہوا، کوئی چارہ کاٹتے ہوئے، تو کبھی کوئی لڑکا اسکول کے راستے پر بستہ اور تختی لٹکائے نظر آجاتا۔

وہ لوگ تجسس سے میرے ساتھ بیٹھی سیاہ فراک اور سفید دوپٹے پاجامے میں ملبوس شہزادیوں کی سی آن بان رکھنے والی سنگ مرمر کی حسین مورت کو دیکھ رہے تھے۔ بلکہ جب تک گھر پہنچتے ادھر سب میں ڈھنڈورا پٹ چکا تھا کہ مظہر حسین دلہن لے کر آرہا ہے۔

بے بے جی کے تو اوسان ہی خطا ہو گئے تھے۔ وہ مجھ سے ملیں بھی تو بڑی ہراساں و پریشان کیفیت میں۔

"ننھی! باجی کو غسل خانے لے جاؤ۔ ہاتھ منہ دھونے کے لیے اور ہاں خیال رہے یہ سرائیکی نہیں جانتیں۔ اردو میں بات کرنا۔ بے بے جی آپ کھانے پینے کا بندوبست کریں۔"

میں نے کچھ متذبذب کھڑی میری شکل دیکھتی شمیل کو آنکھ کے اشارے سے ننھی کے ہمراہ جانے کا کہا اور پھر بے بے جی کے گرد بازو ڈال کر لاڈ سے ان

کے ساتھ ٹک گیا۔

"کیا بات ہے بے بے؟ ناراض ہو۔"

"بھلے سے۔ تم نے تو اپنی کرلی۔" ان کا لہجہ نحیف اور مرتعش تھا۔ انہیں سخت صدمہ پہنچا تھا۔ "لے بتا۔ میں اختری کو کیا جواب دوں گی۔ اسے کہہ چکی تھی شمیم کے لیے۔ مجو پتر تو ایسا تو نہیں تھا۔"

"بے بے جی! اتنی بے اعتباری۔" میں بڑی مدتوں بعد کھل کر بے فکری سے ہنسا تھا۔ "ارے یہ تمہاری بہو تھوڑی ہے بے بے۔ یہ تو ہماری مہمان ہیں۔ خان زادی ہیں۔ میرے مالک کی بیٹی۔ انہیں وہاں جان کا خطرہ تھا۔ مالک نے مجھ سے مدد مانگی اور ہدایت کی کہ اپنے گاؤں لے جاؤں حفاظت کے لیے۔ کچھ دنوں میں خطرہ ٹلنے کے بعد وہ ہمیں واپس بلالیں گے۔"

"اوہ۔ اچھا۔ شکر ہے۔ تو پتر۔ پہلے بتانا تھا ناں سارا قصہ۔" بے بے جی کی جان میں جان آگئی۔ چہرے کی رونق فوراً بحال ہوگئی تھی۔

"اے میں تو حق دق ہی رہ گئی تھی۔ بھلا میرا پتر ایسا ہو سکتا ہے۔ اچھا چل تو اندر جا کر آرام سے بیٹھ۔ میں ہانڈی دیکھتی ہوں۔ تم نے بہت اچھا کیا جو بچی کو لے آئے۔ آخر اس کے باپ نے بھی تو تیری مدد کی تھی۔"

یہاں کے زیادہ تر لوگ سرائیکی بولتے تھے۔ سانولی سلونی رنگت، جامنی ہونٹ، سخت جان، جفاکش اور بہادر لوگ یہاں بستے تھے۔ شمیل زبان سے ناواقف ہونے کے باوجود گاؤں والوں کے سلوک سے بے حد متاثر تھی۔ بے بے جی کو تو اردو نہیں آتی تھی۔ البتہ اظہر اور ننھی سے خوب گپ شپ چلتی۔ ہمیں آئے پانچ دن ہوئے تھے۔ جب خان حیات ابراہیم کی طرف سے رجسٹرڈ ڈاک سے ایک خط ملا۔ اس میں مختصراً لکھا تھا۔

"مظہر بیٹے!

خطرہ ٹل گیا ہے۔ دونوں چلے آؤ۔ ہم شدت سے منتظر ہیں۔"

میں نے شمیل کو خط تھمادیا۔

"آپ چلنے کی تیاری کریں۔" میں نے بغور اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے خوشی کی لہر ڈھونڈنی چاہی۔ "آپ کو بہت بہت مبارک ہو یہ رہائی۔ اب روز روز کی دربدری سے نجات مل چکی ہے۔ انشاء اللہ کچھ عرصے بعد آپ اپنی من چاہی اور خوشگوار زندگی کے سفر کا آغاز کر رہی ہوں گی۔"

"ضروری نہیں ہے کہ منتوں مرادوں کے بعد طلوع ہونے والے دن کا سورج اتنی ہی خوشی اور سکون لے کر آئے جتنا کہ سوچ رکھا ہوتا ہے۔"

اس کا چہرہ نارمل ہی تھا۔ کمال ہے اس خبر پر تو اسے خوشی سے گلاب کی طرح کھل جانا چاہیے تھا۔ میں اس کے چہرے سے کوئی خاص تاثر اخذ نہ کر سکا۔

"دوبارہ ضرور آیئے گا شمیل باجی۔" اظہر نے جاتے سمے بڑی لگاوٹ سے فرمائش کی تھی۔ شمیل دھیمے سے مسکرا کر اسے دیکھنے لگی۔

"ہاں۔ ابھی دو تین ماہ بعد مظہر بھائی جی کی شادی ہوگی۔ بے بے جی نے ماسی اختری کو بتادیا ہے۔ آپ نے ان کی شادی پر تو ضرور ہی آنا ہے۔ میں آپ کو خط لکھ کر بتادوں گی۔" ننھی کی پرجوش اطلاع پر بے ساختہ شمیل کی نظر مجھ پر جم گئی تھی۔ میں نے بھی لاشعوری انداز میں اس کی طرف دیکھا تھا۔ شمیل کی نظروں میں ایک گمبھیر سی سنجیدہ سی خاموشی اور سناٹا تھا۔ میں نے آہستگی سے نظر چرالی۔ ہم لوگوں کی واپسی بذریعہ ٹرین ہوئی۔ اٹک شہر کے اسٹیشن تک ہمیں ٹرین سے جانا تھا۔ جیپ تو میں لاہور ہی چھوڑ آیا تھا۔ افراتفری میں۔

"چلیے۔ تمت بالخیر۔ یہ میرے ساتھ آپ کا آخری سفر ہے۔" میں نے ہلکے پھلکے انداز میں اسے مخاطب کیا تھا۔

"کون جانتا ہے آگے کیا ہوگا۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"انشاء اللہ بہتر ہی ہوگا۔" میں نے خلوص سے اس کی طرف دیکھا۔

"شمیل بی بی! ایک بات آپ سے کہنا تھی۔ میرا اور آپ کا تقریباً بیس دن تک مسافرت کا ساتھ رہا ہے۔ اس دوران میں نے اپنی پوری کوشش کی ہے کہ

آپ کا احترام ملحوظ رہے لیکن پھر بھی اگر مجھ سے کوئی گستاخی یا غلطی سرزد ہو گئی ہو تو میں معذرت چاہتا ہوں۔" وہ بھنویں اچکا کر کچھ دیر تک جواباً" مجھے دیکھتی رہی۔

"میں نے اس طویل سفر میں آپ کو بالکل ویسا ہی پایا جیسا سنا تھا۔ شریف، بہادر اور باکردار۔" اس کے پروقار لہجے میں میرے لیے تحسین تھی۔

"اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔" میں نچلے لب کا کونہ دانتوں میں دبا کر مسکرایا۔

"آپ تکلف کی مار کیوں مارتے ہیں مظہر! ہر بات پر غیریت کی دیوار تان دیتے ہیں۔" وہ کچھ جھنجھلائی۔

"آپ سے ڈر جو لگتا ہے؟" میں خلاف عادت شوخ سا ہو گیا۔

"آپ بہت خوش لگ رہے ہیں۔" وہ پنی تلی نظر مجھ پر ڈال کر عجیب سے انداز میں گویا ہوئی۔

"جی۔ اس لیے کہ میں واقعی خوش ہوں۔ اپنی ذمہ داری احسن طریقے سے نبھانے پر ویسے اصولاً" تو مجھ سے زیادہ آپ کو خوش ہونا چاہیے۔"

اس کے چہرے پر کچھ بے بس سی ناگواری سی کیفیت طاری تھی۔ تاہم وہ خاموش بیٹھی لب چباتی رہی۔

"میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں نے آپ کو اس سے برعکس پایا جیسا سنا تھا۔"

وہ حیران نظریں مجھ پر ٹکا کر متوجہ ہو گئی۔

"آپ کی خود پسندی، خاموشی اور سرد مہری کے بڑے چرچے سنے تھے۔ لیکن میں نے آپ سے مل کر تفصیلی تجزیہ کر کے یہ جانا ہے کہ جسے لوگ آپ کی سرد مہری سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ حقیقتاً" مردوں کو فاصلے اور حد پر رکھنے کی ایک تدبیر ہے۔ جسے خود پرستی کا نام دیتے ہیں وہ نسوانی تفخر و مان ہے اور نسائیت کا تقاضا بھی۔ اور رہی خاموشی تو دراصل یہ آپ کی باحیا اور شرمیلی فطرت کی عکاسی کرتی ہے۔"

شمیل کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

"اگر ایسا نہ کیا جائے۔ مظہر صاحب تو عورت کے احترام کا تصور بھی فنا ہو جائے۔ مرد عورت کی خوش اخلاقی، نرم زبانی اور شرم و حیا کا ہمیشہ غلط مطلب لیتا ہے اور جھٹ خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اسلام میں حکم دیا گیا ہے کہ عورتیں جب غیر مردوں سے مخاطب ہوں تو سپاٹ اور سرد و سخت لب و لہجہ اختیار کریں تاکہ سننے والے کے دل میں کوئی جذباتی کیفیت بیدار نہ ہو۔ خوامخواہ کی اخلاقیات میں پھنس کر خواتین مردوں کو بے تکلف ہونے اور حد پار کرنے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔"

"میں بھی تو آپ کے لیے غیر مرد ہوں۔ اصولاً" تو مجھ سے بھی آپ کا برتاؤ سخت ہونا چاہیے تھا۔" میں یونہی شرارتاً" بول پڑا۔ اس نے کشمکش کے عالم میں مجھے دیکھا پھر سر جھکا کر گود میں رکھے ہاتھ کے ناخن دیکھنے لگی۔

"بے شک عارضی ہی سہی لیکن گزشتہ ایک ماہ سے آپ میرے شرعی محرم بنے ہوئے ہیں۔ میرا آپ سے جائز اور قانونی تعلق ہے۔ اس لیے۔"

"پلیز۔ میں مذاق کر رہا تھا شمیل بی بی!" میں نے فوراً" ہاتھ اٹھا دیا تھا۔ اٹک سے آگے کا سفر بائی روڈ تھا۔

شام ہونے تک ہم لوگ حویلی پہنچ چکے تھے۔ خان حیات ابراہیم اور خان وجاہت نے بڑے تپاک سے استقبال کیا۔ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر ملازمین کو خاطر تواضع کا آرڈر دینے کے بعد دونوں شمیل کے ساتھ اندر چلے گئے تھے۔ غالباً" تمام تر حالات و واقعات خان زادی کے منہ سے سننا چاہتے تھے۔ خان وجاہت کے چہرے پر اضطراب آمیز سناٹا تھا۔ لیکن جب وہ آدھے گھنٹے بعد اچھی طرح تسلی کر لینے کے بعد خان حیات ابراہیم کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں آئے تو وہ بہت مطمئن اور پرسکون دکھائی دیے۔

"ہمیں خوشی ہے مظہر بیٹے! کہ تم نے اپنا عہد پورا کیا۔ تم وفاداری اور ایمانداری کے اس امتحان پر پورے اترے ہو۔ ہم تم سے بہت خوش ہیں اور فکر نہ کرو۔ تم ہر طرح سے محفوظ ہو۔ ہم نے اپنے قبیلے کے بندوں کو سمجھا دیا ہے۔ تم پر کوئی بندوق نہیں

اٹھائے گا۔ فیصلہ ہونے میں ہفتہ دس دن تو لگیں گے۔ تب تک چاہو تو حویلی رہ جاؤ۔ ورنہ اپنی پرانی رہائش گاہ میں چلے جاؤ۔ فیصلہ ہوجانے کے بعد تمہیں یہاں کی نوکری سے تو ہاتھ دھونے پڑیں گے لیکن تسلی رکھو ہم تمہارے گاؤں کے قریبی شہر کے ایک مشہور اسپتال میں تمہاری جاب کا انتظام کررہے ہیں۔ بس ایک دو دن تک ادھر سے فائنل کال آجائے گی۔ اگر کوئی مسئلہ ہوا تو ہم تمہیں ذاتی کلینک بنوادیں گے وہیں دہاڑی میں۔ اب تم جاؤ آرام کرو۔"

میں سعادت مندی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

واپسی کا سفر طے کرتے ہوئے میں عجیب سے محسوسات کے ہمراہ اپنی رہائش گاہ کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔

سرخروئی کے احساس نے ذہن کو ہلکا پھلکا کردیا تھا۔ بیس دنوں کی رفاقت پر مشتمل ایک عجیب و غریب اور پرخطر سفر اپنے اختتام کو پہنچا تھا۔

یہ غالباً" بلکہ یقیناً" میری زندگی کا سب سے انوکھا سفر تھا۔

راہ میں کبھی پھول آئے، کبھی خار، کبھی تشکیک کا دھواں پھیلا تو کبھی اعتماد و اپنائیت کے بے ساختہ چشمے پھوٹے، کبھی خوف تو کبھی بہادری۔

کبھی جنگل تو کبھی میدان۔

دیکھو ذرا ادھر کہ چلے تھے جہاں سے ہم۔

کچھ پھول، کچھ چراغ ابھی واہموں میں ہیں۔

بے اعتمادیوں کا دھواں بھی سہی مگر۔

بکھرے ہوئے گلاب ابھی راستوں میں ہیں۔

اک پل رکو، یہیں سے بدلنے ہیں راستے۔

ٹھہرو ذرا کہ موڑ جدائی کا آگیا۔

اب سامنے ہی اور ہواؤں کا شہر ہے۔

اب تک تو اس طرف جو گیا سو چلا گیا۔

شمعیں تو کیا یہاں دیدہ و دل بھی بجھ گیا۔

ٹھہرو ذرا کہ مرگ تمنا سے پیشتر۔

اپنی رفاقتوں کو پلٹ کر بھی دیکھ لیں۔

گزری مسافتوں پہ بھی ڈالیں ذرا نظر۔

قربت کی ساعتوں کا مقدر بھی دیکھ لیں۔

شاید کہ مل سکیں نہ نئے موسموں میں ہم۔

جاتی رتوں کے آخری منظر بھی دیکھ لیں۔

دریائے سوات کے کناروں پہ جمی برف کافی سے زیادہ پگھل چکی تھی۔ موسم بھی تو بدل رہا تھا۔ ہواؤں کی برودت میں خاصی کمی آگئی تھی۔

اپنے رہائشی مکان میں آکر میں نے ساری کھڑکیاں کھول دیں۔ اتنے روز بند رہنے کی وجہ سے گھٹن سی ہوگئی تھی۔

"چل بھئی مظہر حسین! پہلے گرد سفر جھاڑ اور پھر گرد خانہ۔" میں کپڑے نکال کر غسل خانے کا رخ کرتے ہوئے خوامخواہ ہنس دیا۔ نہا دھو کر میں چائے کا سامان ڈھونڈنے لگا۔

چوکیدار کی میرے جانے کے بعد غالباً" حویلی یا ہسپتال میں ڈیوٹی لگادی گئی تھی۔ اب خود ہی کچھ کرنا تھا۔

†—†—†

"اس سے پہلے میں نے صرف کتابوں کہانیوں میں پڑھ رکھا تھا کہ شرم و حیا عورت کا زیور اور مرد کی پگڑی ہوتی ہے۔ میں ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتی تھی۔ مگر اب میں نے عملاً" پرکھ لیا ہے آیا اماں کہ دنیا میں ایسے مرد بھی موجود ہیں جو ٹھوس کردار رکھتے ہیں۔ حیادار مرد کی نظر عورت کو اجال دیتی ہے۔ اسے نہال کردیتی ہے اور— اور آیا اماں مجھے اجلا نکھرا رہنے کا بہت شوق ہے۔"

شمیل نے اچانک ہی سر جھکالیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں کو آپس میں مسل رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اضطرابی کیفیت نمایاں تھی۔

"تم بڑی مشکل باتیں کرنے لگی ہو شمیل بیٹی۔ مجھ بڑھیا کی سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔"

عمر رسیدہ اور وفادار آیا نے بے بسی سے اس کی شکل دیکھی۔ شمیل کی ماں کی وفات کے بعد حویلی کی سب سے معمر ملازمہ نے اس کی پرورش کا بیڑہ سنبھال لیا تھا۔ اسی وجہ سے انہیں حویلی میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ خان حیات ابراہیم ان پر بہت اعتماد کرتے تھے اور انہوں نے ہی آیا اماں کو بلا کر

صورت حال واضح کرتے ہوئے قبیلے کے لوگوں کے فیصلے سے آگاہ کیا تھا تاکہ وہ سمیل تک پہنچا دیں۔

"میں دھڑکوں اور واہموں کے درمیان لٹک کر خود کو تباہ نہیں کرنا چاہتی۔ آج کس بہانے کس سے ملاقات کے لیے دیر ہوئی۔ کس کی چادر چھینی۔ کس کس سے دل بہلایا۔ شادی کے لیے معیار قرابت داری اور امارت ہی کیوں ٹھہرے۔ شرافت کیوں نہیں۔"

اس کے انداز میں ہٹ دھرمی اور قطعیت تھی۔ آیا اماں ششدر سی اس کی صورت دیکھ رہی تھیں۔ اسے واپس لوٹے پانچواں دن تھا۔ خان حیات ابراہیم نے قبیلے کے سردار کی حیثیت سے گاؤں کے چند معتبر بندوں کو بلا کر معاملے کا جائزہ لینے کی رسمی کارروائی مکمل کرلی تھی۔ معززین نے دوٹوک فیصلہ سنا دیا تھا کہ خان زادی کا نکاح فسخ کرا کے اسے خان وجاہت ابراہیم کی زوجیت میں دے دیا جائے اور مظہر حسن کو وادی چھوڑنے کا حکم دیا جائے۔ فریقین کو سوچ بچار کے لیے کل کے دن تک مہلت دی گئی تھی۔ پرسوں حتمی کارروائی عمل میں لائی جانی تھی۔ مگر سمیل بہت پہلے فیصلہ کرچکی تھی۔

"بیٹی! تم جو کہنا چاہتی ہو صاف کھل کر کہو۔ تاکہ میں خان جی تک تمہارے خیالات پہنچا سکوں۔" آیا اماں لجاجت آمیز نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔ وہ ان کے پاس بیٹھ گئی اور ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

"آیا اماں! آپ میرے لیے ماں کی جگہ بھی ہیں اور سہیلی بھی۔ میں آپ سے ہر بات کھل کر کہہ سکتی ہوں۔ میں آپ کو بتاتی ہوں جب ہم یہاں سے نکلے تو کیا کیا واقعات پیش آئے۔" یہ کہہ کر وہ الف تا یے انہیں سلسلہ وار حالات سناتی چلی گئی۔

"وہ شخص ایسے لمحوں میں ثابت قدم رہا جب اسے پورے مواقع حاصل تھے۔ میں تو ان ہی لمحوں میں اس کی شرافت اور بلند کرداری کی اسیر ہوگئی تھی۔ اور میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر زندہ بچ گئی تو بقیہ زندگی اسی کے نام ہوگی۔"

"مگر وہ خان وجاہت کا کیا ہوگا بیٹی۔" آیا اماں کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

"ایسے شخص کا انجام نارسائی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ جو منگیتر کے ہوتے ہوئے پرائی لڑکیوں پر ہاتھ ڈالنے سے باز نہیں آیا۔ آج سے نہیں شروع سے ہی اس کے یہی اطوار رہے ہیں۔ لیکن اب میں سمجھوتا نہیں کرسکتی۔ یہ چانس مجھے قدرت نے دیا ہے۔ خان وجاہت کا ایمان تو اس درجے کمزور ہے کہ انہیں جائز، ناجائز کی تمیز بھی نہیں رہتی۔ ابھی یہ رنگ ڈھنگ ہیں تو بعد میں تو سوکن لانے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔ وہ تو تم پر جان چھڑکتے ہیں بس بھول چوک تو ہو ہی جاتی ہے بیٹی! یہ تو وقت گزاری کے بہانے ہوتے ہیں سب۔"

"نہیں آیا اماں۔ ایسا عموماً" ایمان کی کمزوری کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور کمزور ایمان والا کسی رشتے کی عزت برقرار نہیں رکھ سکتا۔ مجھے خان وجاہت کے طور طریقے شروع سے ہی کھٹکتے تھے۔ مگر رشتے کی نوعیت ایسی تھی کہ لامحالہ مجھے خاموشی اور نظرانداز کی عادت اپنانی پڑی۔ کہ خان بابا کی یہی مرضی تھی۔ مگر اب اتنے بڑے دھچکے کے بعد میں خاموش نہیں رہ سکتی۔ اس دفعہ تو کسی نہ کسی طرح خان بابا نے تدبیر لڑا کر مجھے بچالیا اگر کچھ عرصے بعد پھر کسی کی عزت پر ہاتھ ڈال دیا تو کیا مجھے اس کی بیوی کی حیثیت سے دوبارہ دشمن کی خدمت میں پیش کیا جائے گا؟"

آیا اماں چپ کی چپ رہ گئیں۔

"سوچ لو بیٹی! اگر فیصلہ مظہر حسین کے حق میں دو گی تو یہ علاقہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑنا پڑے گا۔ پھر وہ ایک معمولی سا آدمی ہے۔ ایک عام ڈاکٹر کی معاشرے میں حیثیت ہی کیا ہوتی ہے؟"

"باکردار انسان کبھی عام نہیں ہوتا اور رہی حیثیت تو وہ ہم دونوں مل کر خود بنالیں گے اور دوسروں سے منوا بھی لیں گے۔ بس ارادے مضبوط ہونے چاہئیں۔"

آیا اماں دم بخود بیٹھی ٹکر ٹکر اس کی صورت دیکھ رہی تھیں۔

"اس سے بھی پوچھ لیا ہے۔ اس کی کیا مرضی ہے؟

ہو سکتا ہے اس کا یا اس کے گھر والوں کا ارادہ کہیں اور ہو۔" شمیل کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔

"یہی پوچھنے کے لیے میں آج اس کی رہائش گاہ پر جا رہی ہوں۔ آپ ذرا دھیان رکھیے گا۔ میں ایک گھنٹے میں لوٹ آؤں گی؟۔" وہ اچانک کھڑی ہو گئی۔

"ابھی۔ اس وقت؟۔" آپا اماں خوفزدہ ہو گئیں۔ شام گہری ہونے لگی تھی۔ اور خان ابراہیم کسی کے حویلی آیا ہی چاہتے تھے۔

"بیٹی! صبح پوچھ لینا۔ خان جی آنے والے ہیں اور خان وجاہت بھی گھر پر ہیں۔ انہوں نے پوچھ لیا تو میں کیا بتاؤں گی۔" میرون اونی کپڑوں پر میرون شال اچھی طرح اوڑھتی شمیل کی طرف دیکھتے ہوئے آپا اماں بے بسی سے گویا ہوئیں۔

"کوئی بہانہ کر دیجئے گا۔ میں ابھی آئی۔ کل کبھی نہیں آیا کرتی آپا اماں جو کچھ ہے وہ آج ہے۔" وہ تیز قدموں سے پیدل ہی گھر چل پڑی، جانتی تھی کہ کل سارا دن خان حیات اور خان وجاہت گھر میں رہیں گے اور مظہر کو بلا کر طلاق نامے پر سائن کروالیں گے۔ وہ اس سے پہلے مظہر تک پہنچنا چاہتی تھی۔

♥_♥_♥

"آ۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ۔۔۔ یہاں۔۔۔ اس وقت۔۔۔" اگر کوئی بم بلاسٹ ہو جاتا تو بھی مجھے اتنی گھبراہٹ نہ ہوتی جتنی اس وقت شمیل کو اپنے دروازے پر دیکھ کر ہوئی۔ وہ بالکل اکیلی تھی۔

"مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ کیا میں اندر آسکتی ہوں؟۔" اس نے متانت سے کہا۔

"جی۔۔۔ جی۔۔۔ پلیز۔" میں بوکھلا کر ایک طرف ہو گیا۔

"معاف کیجئے گا۔ میرے پاس خواتین کو بٹھانے کے لیے کوئی مناسب انتظام نہیں ہے۔ یہی ایک کمرہ ہے جہاں میں کھاتا، سوتا اور پڑھتا ہوں۔ آپ کو یہیں زحمت کرنا ہوگی۔"

کشادہ کمرے کے دائیں طرف میرا پلنگ تھا۔ اس کے مقابل ایک میز تھی جس کے ساتھ کتابوں کا ریک رکھا ہوا تھا۔ کمرے میں فقط دو کرسیاں تھیں جن میں سے ایک پر میلے کپڑوں کا ڈھیر تھا اور دوسری پر میڈیسن کی چار پانچ کتابیں بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔ میز پر چائے کا خالی کپ اور دوپہر کے کھانے کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ مجھے فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کہاں بٹھاؤں۔ جب تک یہ عقل آتی کہ کرسی سے کتابیں اٹھالوں تب تک وہ طائرانہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی ہوئی مدھم مسکراہٹ لیے میرے پلنگ کے کنارے پر بیٹھ چکی تھی۔

"معاف کیجیے گا میں ابھی آتا ہوں۔ چولہے پر سالن رکھا ہوا ہے۔"

کچھ جلنے کی خوشبو نتھنوں میں گھستے ہی میں بیوقوفوں کی طرح اٹھ کر کمرے کے دائیں جانب بنے کچن کی طرف دوڑا تھا۔ چولہا بند کر کے واپس کمرے میں آیا تو خاصی حد تک اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پا چکا تھا۔ موسم صبح سے ابر آلود تھا۔ کسی بھی لمحے بارش ہونے کا امکان تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اتنے خراب موسم میں جبکہ رات پڑنے کو تھی میرے پاس کیوں آئی تھی۔ خان حیات ابراہیم یا خان وجاہت کو خبر ہو گئی تو بہت برا ہوگا۔ اس نے خطرہ مول لے کر مجھ تک پہنچنا کیوں ضروری خیال کیا۔

"جی آپ کہئے۔ کیا کہنا چاہتی ہیں۔ ویسے آپ کو اس طرح یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔" میں کرسی پلنگ کے مقابل لا کر کچھ فاصلے پر رکھ کر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے مخاطب ہوا۔

"مگر کیوں۔ میں کسی غیر کے پاس تو نہیں آئی؟۔" معاً" اس نے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ نظریں ملیں اور نجانے کس احساس نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا کہ میں نگاہ نہ بچا سکا۔

وہی خوابناک آنکھیں، یاقوتی لب، چاندی جیسی رنگت اور بالوں کا سیاہ ریشم جو بیس دن تک شب و روز تک میری آنکھوں کے سامنے رہا تھا۔ اب بھی میرون شال کے ہالے میں نظر کو خیرہ کر رہا تھا۔ وہ دوبارہ نظریں جھکا چکی تھی۔ میں نے سر جھٹک کر اپنے دماغ کو حاضر کیا۔

"اب تو غیر ہی سمجھ لیں۔ کل خان جی نے مجھے

حویلی بلایا ہے اور آپ جان ہی چکی ہیں کہ کس لیے۔"

"کیا آپ یہ سب اپنے دل سے پوچھ کر کہہ رہے ہیں؟۔" نجانے کیوں اس کی آواز لرز گئی۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"میں یہ فیصلہ اپنے ضمیر کی آواز پر کر رہا ہوں۔ میں امین ٹھہرایا گیا تھا اور اب وہ وقت آگیا ہے جب میں امانت واپس کر کے ایمان کی آزمائش میں سرخرو قرار دیا جاؤں۔"

"مگر میں ایسا نہیں چاہتی۔" وہ لب کاٹ کر جھکے سر کے ساتھ گویا ہوئی۔ مجھے کرنٹ ہی تو لگا تھا۔

"مگر کیوں؟ خان وجاہت آپ کے منگیتر ہیں اور آپ انہیں پسند بھی کرتی رہیں پھر۔۔۔"

"وہ میرے منگیتر ضرور رہے ہیں یہ سچ ہے اور اس رشتے کے احترام میں، میں مروتاً" ان سے بات بھی کر لیتی تھی لیکن وہ میری پسند یا انتخاب کبھی بھی نہیں تھے۔ اس وقت فیصلے کی ڈور خان بابا کے ہاتھ میں تھی، لیکن اب وہ یک طرفہ فیصلہ صادر کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ اس فیصلے میں آپ بھی شریک ہیں اور میں چاہتی ہوں آپ میرے حق میں فیصلہ دیں۔"

"آپ کے حق میں؟۔" میں احمقوں کی طرح منہ کھولے ٹکر ٹکر اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔

"آپ کی بے بے جی بہت نرم دل اور محبت کرنے والی خاتون ہیں۔ وہ شمیم کے بجائے مجھے بہو کے روپ میں دیکھ کر خفا تو ہوں گی مگر مجھے یقین ہے، وہ مجھے ضرور قبول کر لیں گی۔ میں ان کو اپنی محبت اور خدمت سے راضی کر لوں گی۔ ننھی، صغریٰ آپا اور اظہر بھی یہ اطلاع پا کر خوش ہوں گے۔ ہاں آپ کا مسئلہ ہے البتہ۔ اگر آپ کو شریک زندگی کے طور پر میری ہمراہی پر اعتراض نہ ہو تو ہم کل ہی علاقہ چھوڑ کر یہاں سے روانہ ہو سکتے ہیں۔"

اس نے رخ موڑ کر اپنی بات کا مکمل مفہوم سمجھا دیا۔

میں پتھر کے بت کی طرح ایستادہ اس کا سراپا دیکھ رہا تھا۔ بے بے جی کو تو واقعی راضی کیا جا سکتا تھا کیونکہ انہوں نے شمیم کے لیے بطور خاص مجھ پر دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ ماؤں کو تو بس اپنے ہاتھ سے بیٹوں کے سر پر سہرا سجانے کی چاہ ہوتی ہے۔ میں شمیل کو اپنے ہمراہ وہاڑی لے جا کر ان سے کہہ سکتا تھا کہ جان کے خطرے کے پیش نظر لڑکی کے باپ کی خواہش پر اسے یہاں لایا ہوں۔ ابھی شادی نہیں ہوئی۔ چاہیں تو اسے اپنی بیٹی سمجھ کر اپنے ہاتھوں سے دلہن بنا کر بیٹے کا گھر آباد کر دیں اور اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں احسان فراموشی کا مظاہرہ کروں تو ابھی آپ کے حکم پر اسے واپس اس کے علاقے میں چھوڑ آتا ہوں۔

مجھے یقین تھا، بے بے جی اس جذباتی بلیک میلنگ پر ایک منٹ میں رام ہو جائیں گی اور جھٹ اسے کلیجے سے لگا لیں گی۔ وہ سیدھی سادی دیہاتی عورت تھیں۔ انہیں چھل فریبوں کی کیا خبر۔ جو کہوں گا اس پر آنکھ بند کر کے ایمان لے آئیں گی۔ مگر مسئلہ خود شمیل کا تھا۔

"کیا آپ نے اچھی طرح سوچ لیا ہے۔" میں کچھ جھجکتے ہوئے اس کے سامنے اس سے دو فٹ کے فاصلے پر کھڑے ہو کر پوچھنے لگا۔

شگفتہ محمود کی مرتب کردہ
"خاتون کا دسترخوان" اور "کرن دسترخوان"
کے بعد
خوبصورت رنگین تصاویر کے ساتھ پہلی بار چینی
کھانوں کی مکمل کتاب
چائنیز کھانے
قیمت 150/ روپے
ڈاک خرچ 16/ روپے
منگوانے کا پتا
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار کراچی

"میرا مطلب ہے مجھ جیسے غریب اور عام سے بندے کے ساتھ گزارا کر سکیں گی؟ ایسا نہ ہو آپ کو بعد میں پچھتانا پڑے۔"

"پچھتانے کی کوئی وجہ ہو ہی نہیں سکتی۔ آپ شریف ہیں، بہادر ہیں۔ میری عزت و آبرو کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے صحت مند اور باصلاحیت ہیں۔ ایک محنتی ڈاکٹر ہیں۔ یقیناً" اللہ تعالیٰ رزق کا کوئی نہ کوئی وسیلہ بنا دے گا۔ خان بابا وہاڑی میں آپ کے لیے ذاتی کلینک کھول دینے کے انتظامات مکمل کر چکے ہیں۔ ہم دونوں پریکٹس کریں گے۔ زندگی کی گاڑی مل کر کھینچیں گے۔"

اس کے پاس ہر بات کی دلیل وضاحت کے ساتھ موجود تھی۔ میرے ہونٹوں پر ایک خوبصورت مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

"لگتا ہے، آپ پوری تیاری سے آئی ہیں۔" میں قدم بڑھا کر درمیانی فاصلہ کم کرتے ہوئے مسکرایا۔

"اگر آپ کا یہی فیصلہ ہے اور آپ اس پر ثابت قدم ہیں تو میں بھی یہی کہوں گا کہ چلیں اب بادبان کھولیں دوبارہ سفر کا آغاز کرنے کے لیے۔ قسمت سے اگر اتنی اچھی بیوی مل گئی ہے تو میں بھلا کیوں کفران نعمت کروں گا۔"

میں نے کچھ جھینپتے ہوئے، سر کھجاتے ہوئے آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ وہ بھی جھینپ رہی تھی۔

"آپ نے دلی رضامندی کے ساتھ یہ فیصلہ کیا ہے ناں؟"

وہ ابھی تک متذبذب تھی۔ جواب میں، میں نے زبان سے کچھ نہیں کہا، بس اک نظر وارفتگی سے اسے دیکھا، پھر بے تابانہ اس کے ہاتھ کھینچ کر اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔ میری گرفت کی شدت ہی میرے جذبات کی غماز تھی۔

زبان سے اسے کیسے بتاتا کہ میں بھی تو اس کے سحر سے بچ نہ سکا تھا۔ اسی دن اس کا اسیر ہو گیا تھا جب وہ میرے لائے ہوئے سرخ کپڑوں میں ملبوس اچانک سامنے چلی آئی تھی۔ وہ میری پہلی بے ساختہ و بلا ارادہ نظر تھی جو اس کی جانب اٹھی تھی اور پھر نظر لوٹ کر نہیں آئی لیکن میں نے نہ صرف اس سے بلکہ خود سے بھی یہ راز چھپا کر رکھا تھا۔ اس لیے کہ میں بدنیت اور بدعہد نہیں کہلانا چاہتا تھا۔

پھر اس کے بعد کیا ہوا۔

یہ ایک طویل اور تھکا دینے والی داستان ہے۔ خان وجاہت ابراہیم میرے طلاق نامے سے انکار پر بری طرح بپھر گئے تھے انہوں نے مجھ پر رائفل تان لی مگر خان حیات ابراہیم نے فوری مداخلت کرتے ہوئے مجھے اپنے گارڈز کے حوالے کر دیا۔ وہ اپنی بیٹی کی خوشی اور ضد کے آگے جھک گئے تھے اور خان وجاہت کو کسی طرح سمجھا بجھا کر وقتی طور پر ٹھنڈا کر دیا۔

اگلی رات انہوں نے پراسرار انداز میں مجھے اور شمیل کو یہاں سے فرار کروا دیا۔

میں شمیل کو لے کر سیدھا اپنے گاؤں کرم پور چلا آیا۔ بے بے جی کو کس جدوجہد سے منایا یہ بھی ایک صبر آزما کہانی ہے۔

بہرحال تین ماہ ہم لوگ گاؤں ٹھہرے۔ اس دوران خان حیات ابراہیم نے اپنے وعدے کے مطابق وہاڑی میں کلینک کھلوا دیا اور میں شمیل کو لے کر شہر میں کرائے کے فلیٹ میں شفٹ ہو گیا۔

آج اس واقعے کو ایک سال ہونے والا ہے۔

ہم دونوں میاں بیوی اپنا کلینک خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں۔ اور اس قابل ہو گئے ہیں کہ فلیٹ چھوڑ کر ایک کشادہ سا مکان قسطوں پر خرید لیا ہے۔ بے بے جی، ننھی اور اظہر کو بھی یہیں شہر میں بلوا لیا ہے، خان حیات ابراہیم اس دوران تین مرتبہ وہاڑی آ کر چپکے سے ہم سے مل کر گئے ہیں۔ شمیل کو آج کل بے بے جی نے کلینک آنے سے سختی سے منع کر رکھا ہے کیونکہ وہ چار پانچ ماہ بعد ہمارے گھر کے آنگن میں ایک مہکتا ہوا جیتا جاگتا پھول کھلانے والی ہے۔

بظاہر یہ سب کچھ خیال و خواب اور افسانہ سا لگتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی افسانوی سچویشن حقیقت کا حصہ بھی بن جایا کرتی ہے۔ کیا آپ بھی ایسا سمجھتے ہیں؟

♥